سچے جھوٹ

فرحین چوہدری

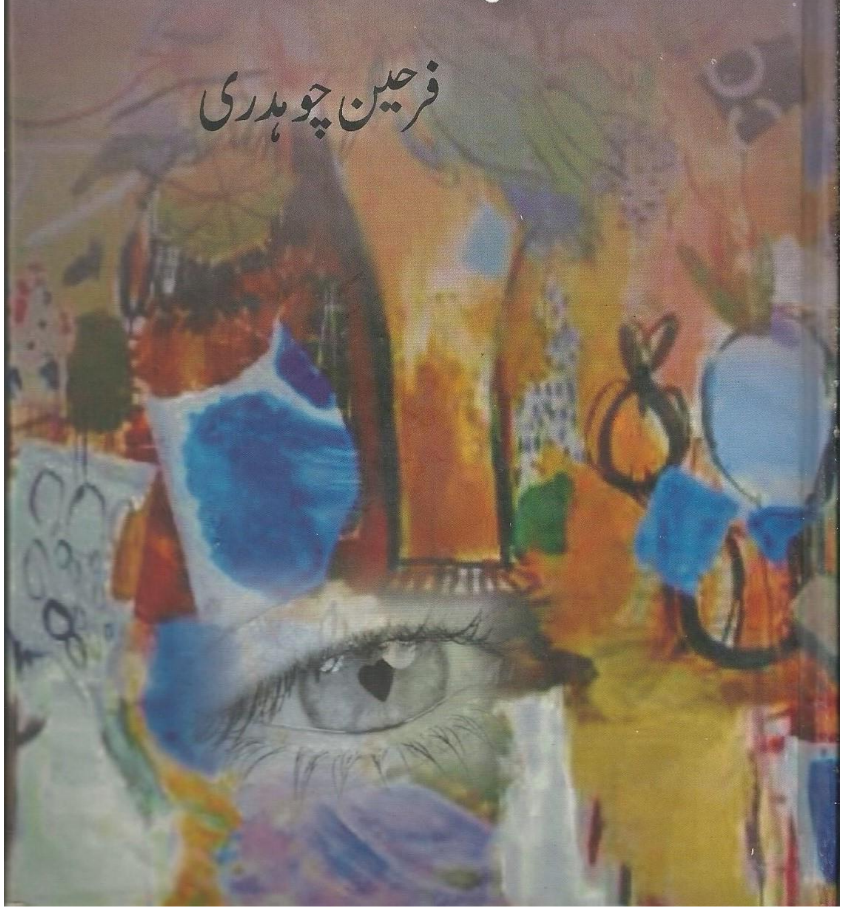

سچّے جھُوٹ

فرحین چوہدری

دستاویز مطبوعات لاہور

دستاویز کی دستاویز کتابیں

اہتمام و اشاعت

اشرف سلیم

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب: سچ جھوٹ

مصنف: فرحین چوہدری

اشاعت: مارچ، ۲۰۱۱

مشینی کتابت: عدنان اشرف

سرِ ورق: ارسلان

قیمت: ۱۵۰ روپے (پاکستان)

۱۰ ڈالر (بیرونِ ملک)

دستاویز

سی159-چناب بلاک نمبر10 علامہ اقبال ٹاؤن لاہور فون: 03334344716

ای میل: saleemashraf86@yahoo.com

لازوال ممتا کے نام

جو ایک ذرّے کی تخلیق سے لے کر ایک کائنات کی تخلیق تک محیط ہے

فہرس

۱	پڑھنے والوں کے لیے!	فرحین چوہدری	۷
۲	بلبلے	ممتاز مفتی	۹
۳	سچے جھوٹ	محمد منشا یاد	۱۷
۴	اس پار		۲۱
۵	بن باندھے بندھن		۲۶
۶	ادھورا آدم		۳۰
۷	میلے فرشتے		۳۳
۸	ازل سے ابد تک		۳۹
۹	سفر		۴۳
۱۰	تہی داماں		۴۷
۱۱	لمحوں کا بہاؤ		۵۱
۱۲	سلیف پورٹریٹ		۵۶
۱۳	برسی		۶۰
۱۴	کھوٹہ سکہ		۶۳
۱۵	ترازو		۶۸
۱۶	مَیں + نہیں = وہ		۷۳

۱۷	بہتے پتھر	۷۸
۱۸	تجدید عہد	۸۴
۱۹	دردِگراں	۸۸
۲۰	بھاری پتھر	۹۱

پڑھنے والوں کے لیے!

سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ شاید اسی فرق کو کھوجنے کا نام ہے تخلیق۔۔۔یا پھر زندگی کا سارا گورکھ دھندہ اسی جستجو، اسی کھوج کی خاطر ہے۔۔۔

ازل سے ابد تک۔۔۔ولی، پیغمبر۔۔۔عام انسان حتیٰ کہ شیطان بھی۔ سچ جھوٹ کے کھیل میں اُلجھا رہا۔۔۔اور اُلجھا ہوا ہے۔

اسی کھوج۔۔۔اسی جستجو نے ۱۹۹۱ء میں سچّے جھوٹ کو جنم دیا۔۔۔۱۹۹۱ء میں اسی تجسّس کا نتیجہ نکلا۔۔۔آدھا سچ۔۔۔ساتھ ساتھ اپنی تلاش کا سفر بھی جاری تھا۔ خود کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے شہبابہ۔ فرحین کے قالب میں ڈھل گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن تلاش کا سفر ختم نہ ہوا۔۔۔۔ نئے سفر کے آغاز پر نئی شناخت کا تروپا بھی ضروری تھا۔۔۔۔سو سچّے جھوٹ اور آدھا سچ نئے رنگ رُوپ کے ساتھ۔۔۔۔اب پھر آپ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔۔

فرحین چوہدری

بلبلے

ممتاز مفتی

شہابہ گیلانی آج کے دُور کی لڑکی کی نمایندہ ہے اُس کی شخصیت کا جزوِ عظیم بلبلے ہیں۔

وہ سوڈے کی بوتل کی مصداق ہے جس میں سے بلبلے اٹھتے رہتے ہیں۔

شہابہ کے جذباتی سلف میں لہریں اٹھتی ہیں چھینٹے اڑتے ہیں۔ گھمن گیھریاں گھومتی ہیں۔

اس کا ذہنی سلف ایک جھیل کی مانند ہے ٹھہرا ہوا نیلا شفاف پانی۔

شہابہ ایک ایسی بہلی ہے جس کا ایک پہیہ گول ہے اور دوسرا چوکور، لیکن یہ بہلی چلتی ہے چلے جاتی ہے یوں جیسے پانی میں راج ہنس تیرتا ہے۔

صاحبو۔ دیکھو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھو کہ انسانی شخصیت کا یہ کتنا بڑا معجزا ہے۔

میرے زمانے میں بڑی بوڑھیاں ایک کہانی سنایا کرتی تھیں کہ پرانے زمانے کی بات ہے، ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ۔ بڑی منتوں کے بعد اس کے گھر ایک بیٹی ہوئی، جو ایک آنکھ سے ہنستی تھی اور دوسری آنکھ سے روتی تھی۔ بادشاہ نے اس کا نام ''شہزادی روہنس'' رکھ دیا
آج کے دُور کی نوجوان لڑکیاں سب ''روہنس'' شہزادیاں ہیں۔

آج کی لڑکی میں تین اوصاف نمایاں ہیں۔ غصہ۔ Depression elation وہ غصے میں چیختی چلاتی ہیں۔

لیکن اگر ماحول چیخنے چلانے کی اجازت نہ دے یا طبعاً اس کی اہلیّت نہ ہو تو ان چیخے، غصے

سے ان کا بند بند تھر کتا ہے، جیسے اس ٹرک کا بند بند تھر کتا ہے جس کا ڈرائیور بریک لگا کر، لیکن انجن چلتا چھوڑ کر خود ٹرک ہوٹل میں چائے پینے کے لیے جا بیٹھتا ہے۔

ہاں تو شہابہ غصے میں چیختی چلاتی ہے پھر ہنس پڑتی ہے اتنا ہنستی ہے کہ آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور پھر ڈیپریشن کا دورہ پڑ جاتا ہے۔

آج کی لڑکی کی یہی داستانِ حیات ہے۔

چھ سات سال گزرے جب شہابہ پہلی بار مجھے ملی تھی۔

اس ملاقات کے کوائف یوں ہیں کہ میرا ایک عزیز اور دوست صباح مفتی میرے پاس آیا کہنے لگا ایک بات پوچھوں۔

مَیں نے کہا پوچھو، لیکن اتنے معذرت خواہ کیوں ہو۔

کہنے لگا میری ایک یونیورسٹی فیلو آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ بڑی دیر سے تقاضہ کر رہی ہے مَیں اسے ٹالتا رہا ہوں۔

کیوں ؟

مَیں نے پوچھا۔

کہنے لگا بڑی اَن جھک خودسر ہے، لیکن بڑی قابل ہے، باکردار ہے لڑکے اس سے ڈرتے ہیں۔

شہابہ مجھے ملی تو مَیں نے دیکھا کہ اک طرفہ تماشہ ہے۔

بات ٹھہری ہوئی یوں جیسے کبھی بہکی نہ ہو۔

آنکھ چھلکی ہوئی یوں جیسے کبھی ٹھہری نہ ہو۔

مَیں تو گھبرا گیا۔ یا اللہ یہ کیا چیز ہے۔

شہابہ مجھے ایک تخلیق کار کی حیثیت سے ملی تھی۔ اتنی چھوٹی عمر اور تخلیق کاری مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

جب اُس نے چار ایک مطبوعہ کہانیاں میرے سامنے رکھ دیں تو مَیں سٹپٹا گیا۔

یہ شغل آپ نے کب اپنایا، مَیں نے پوچھا

جب سکول میں پڑھتی تھی، وہ بولی

محرّک کون تھا؟

بولی کوئی بھی نہیں۔ ہڈی میں رچا بسا ہے۔ پہلے شعر کہے اب کہانیاں لکھتی ہوں۔

مَیں نے ذہنی طور پر مونچھ مروڑی۔ اچھا تو آپ میری شاگرد بننا چاہتی ہیں۔

بالکل نہیں،

وہ بولی،

مَیں چونکا، اتنے بڑے، جانے پہچانے افسانہ نگار کی اتنی ناقدری۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی، مَیں وہی کچھ لکھنا چاہتی ہوں، جو میں لکھتی ہوں کسی کی تصیح پسند نہیں کرتی۔ شاگرد بننا نہیں چاہتی، خود پر کسی کا ٹھپہ لگانا نہیں چاہتی۔

تو پھر یہ کہانیاں آپ کس خوشی میں مجھے دکھا رہی ہیں

وہ قہقہہ مار کر ہنسی، ہنستے ہنستے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

ارے اتنی بڑی بوندیاں اس شفاف جھیل کے عقب میں اتنا گدلا پانی،

کیا یہ کہانیاں آپ مجھے اس لیے دکھا رہی ہیں کہ مَیں واہ واہ کروں۔ مَیں نے پوچھا۔

اُس کی آنکھوں میں بوندیں اور بھی بڑی ہو گئیں۔

اُس نے سر اثبات میں ہلا دیا بولی، آپ ٹھیک کہتے ہیں، شاید یہ کہانیاں مَیں اس لیے لائی ہوں کہ آپ واہ واہ کریں۔ ہاں میرا جی چاہتا ہے کہ لوگ میری کہانیوں پر واہ واہ کریں۔

کہانیوں پر کیوں آپ پر واہ واہ کیوں نہ کریں۔ مَیں نے طنز چلائی،

وہ ہنسی۔

کرتے ہیں، کرتے ہیں سب کرتے ہیں، لیکن مَیں اُنھیں ڈانٹ دیتی ہوں۔

کیوں؟

خود پر واہ واہ کرانا مجھے اچھا نہیں لگتا، وہ سنجیدگی سے بولی۔

لیکن آپ تو عورت ہیں، مَیں نے وضاحت کرنا چاہی۔

اُس نے میری بات کاٹ دی، بولی پتہ نہیں مَیں کیا ہوں۔ بس جو کچھ بھی ہوں یہی ہوں۔

ایسے ہی جینا چاہتی یوں۔

اُن دنوں شہابہ قائداعظم یونیورسٹی سے فارغ ہو چکی تھی۔ فارن ریلیشنز میں ایم اے کر چکی تھی۔ وہ کئی ایک اَدبی ثقافتی اور سماجی تنظیموں کی انتظامیہ کی رکن تھی، اپنے دو ایک جلسوں میں وہ مجھے ساتھ لے گئی وہاں منظر ہی اور تھا۔

نہ وہ بھیگی بھیگی آنکھیں تھیں نہ بڑی بڑی بوندیاں۔ وہ یوں ایستادہ تھی جیسے سرکس کی ہنٹر والی ہو، لڑکوں کو ہدایات جاری کر رہی تھی۔ لڑکوں کی نگاہیں خالی تھیں۔

وہ آپس میں یوں گھلے ملے ہوئے تھے جیسے دونوں میں کوئی فرق نہ ہو، وہ فنکشن کو یوں کنڈکٹ کر رہی تھی جیسے گوریلی لیڈر ہو۔

بہرحال وہ وہ شہابہ نہیں تھی، جو مجھ سے پہلی بار ملی تھی، نہ وہ مسکان تھی

نہ بھگو دینے والی پھوار۔

صرف ایلیشن ہی ایلیشن تھی مردانہ ایلیشن۔

پھر ہم دونوں دوست بن گئے۔ ملنے لگے میرے لیے شہابہ ایک چیلینج تھی۔ مجھے بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیا مرد نے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا یا عورت نے پگڑی باندھی ہوئی تھی۔

اس کے والدین کو پتہ چلا تو وہ مجھ سے آ ملے۔ کہنے لگے بڑی خوشی کی بات ہے کہ شہابہ آپ سے ملتی ہے وہ دل کی بہت اچھی لڑکی ہے، لیکن اوپر تلخی اور غصے کی کوٹنگ کر رکھی ہے آپ اس پر اثر ڈالیں۔

اونہوں مَیں نے سرنفی میں ہلا دیا شہابہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

وہ میرا جواب سن کر بہت مایوس ہوئے۔

وہ آپ کے بس کی بات بھی نہیں، مَیں نے کہا۔ اس کی حیات کا سپتک اور ہے آپ کا اور۔

تو ہم کیا کریں؟

اُنھوں نے پوچھا:۔

آپ اسے کھلی چھوڑ دیں۔ جو مرضی ہے کرے، کرنے دیں روک ٹوک نہ کریں۔

وہ مجھ سے مایوس ہو کر چلے گئے۔

قدرت اللہ شہاب کی وفات کے بعد ایک روز شہابہ نے مجھے کہا۔ پتہ ہے مَیں آپ سے کیوں ملی تھی۔

کیوں ملی تھی مَیں نے دہرایا۔

بولی مَیں آپ کو شہاب کے حوالے سے ملی تھی۔

تم شہاب کو جانتی ہو کیا؟

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔۔۔۔۔

اُن سے ملی تھی کیا۔۔۔۔

ہاں۔۔۔وہ بولی۔ کئی بار۔۔۔۔

کیا اپنی شادی کے سلسلے میں ملی تھی۔۔۔۔

"نہیں"

وہ بولی شادی کے بارے میں مَیں نے کبھی سوچا ہی نہیں،

کب سوچو گی مَیں نے پوچھا۔

اُس نے قہقہہ لگایا بولی جب حشر کا دن آئے گا

تو پھر شہاب سے کس مقصد کے لیے ملی تھی۔ کوئی مقصد تو ہوگا

تھا وہ مسکرائی۔۔۔۔۔

کیا۔۔۔

مقصد شہاب تھا۔

مجھے شہاب اچھا لگتا تھا، بہت اچھا مَیں اسے جا ملی۔

اُس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ کہنے لگے آپ کیسے آئی ہیں۔ مَیں نے کہا بس آئی ہوں۔

اُنھوں نے کہا کوئی مقصد تو ہوگا۔ مَیں نے کہا ہے۔ آپ سے ملنا مطلوب تھا۔

اُس نے میری بات کاٹ دی، بولی پتہ نہیں مَیں کیا ہوں۔ بس جو کچھ بھی ہوں یہی ہوں۔ ایسے ہی جینا چاہتی یوں۔

اُن دنوں شہابہ قائداعظم یونیورسٹی سے فارغ ہو چکی تھی۔ فارن ریلشیئر میں ایم اے کر چکی تھی۔ وہ کئی ایک اَدبی ثقافتی اور سماجی تنظیموں کی انتظامیہ کی رکن تھی، اپنے دو ایک جلسوں میں وہ مجھے ساتھ لے گئی وہاں منظر ہی اور تھا۔

نہ وہ بھیگی بھیگی آنکھیں تھیں نہ بڑی بڑی بوندیاں۔ وہ یوں ایستادہ تھی جیسے سرکس کی ہنٹر والی ہو، لڑکوں کو ہدایات جاری کر رہی تھی۔ لڑکوں کی نگاہیں خالی تھیں۔

وہ آپس میں یوں گھلے ملے ہوئے تھے جیسے دونوں میں کوئی فرق نہ ہو، وہ فنکشن کو یوں کنڈکٹ کر رہی تھی جیسے گوریلی لیڈر ہو۔

بہر حال وہ وہ شہابہ نہیں تھی، جو مجھ سے پہلی بار ملی تھی، نہ وہ مسکان تھی نہ بھگو دینے والی پھوار۔

صرف ایلیشن ہی ایلیشن تھی مردانہ ایلیشن۔

پھر ہم دونوں دوست بن گئے۔ ملنے لگے میرے لیے شہابہ ایک چیلینج تھی۔ مجھے بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کیا مرد نے دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا یا عورت نے پگڑی باندھی ہوئی تھی۔

اس کے والدین کو پتہ چلا تو وہ مجھ سے آ ملے۔ کہنے لگے بڑی خوشی کی بات ہے کہ شہابہ آپ سے ملتی ہے وہ دل کی بہت اچھی لڑکی ہے، لیکن اوپر تلخی اور غصے کی کوٹنگ کر رکھی ہے آپ اس پر اثر ڈالیں۔

اونہوں مَیں نے سر نفی میں ہلا دیا شہابہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔

وہ میرا جواب سن کر بہت مایوس ہوئے۔

وہ آپ کے بس کی بات بھی نہیں، مَیں نے کہا۔ اس کی حیات کا سپتک اور ہے آپ کا اور۔

تو ہم کیا کریں؟

اُنھوں نے پوچھا:۔

آپ اسے کھلی چھوڑ دیں۔ جو مرضی ہے کرے، کرنے دیں روک ٹوک نہ کریں۔

وہ مجھ سے مایوس ہو کر چلے گئے۔

قدرت اللہ شہاب کی وفات کے بعد ایک روز شہابہ نے مجھے کہا۔ پتہ ہے مَیں آپ سے کیوں ملی تھی۔

کیوں ملی تھی مَیں نے دہرایا۔

بولی مَیں آپ کو شہاب کے حوالے سے ملی تھی۔

تم شہاب کو جانتی ہو کیا؟

اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔۔۔۔۔

اُن سے ملی تھی کیا۔۔۔۔

ہاں۔۔۔ وہ بولی۔ کئی بار۔۔۔۔

کیا اپنی شادی کے سلسلے میں ملی تھی۔۔۔۔

''نہیں''

وہ بولی شادی کے بارے میں مَیں نے کبھی سوچا ہی نہیں،

کب سوچو گی مَیں نے پوچھا۔

اُس نے قہقہہ لگایا بولی جب حشر کا دن آئے گا

تو پھر شہاب سے کس مقصد کے لیے ملی تھی۔ کوئی مقصد تو ہو گا

تھا وہ مسکرائی۔۔۔۔۔

کیا۔۔۔

مقصد شہاب تھا۔

مجھے شہاب اچھا لگتا تھا، بہت اچھا مَیں اسے جا ملی۔

اُس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ کہنے لگے آپ کیسے آئی ہیں۔ مَیں نے کہا بس آئی ہوں۔

اُنھوں نے کہا کوئی مقصد تو ہو گا۔ مَیں نے کہا ہے۔ آپ سے ملنا مطلوب تھا۔

شہابہ نے قہقہہ لگایا بولی میری بات سن کر شہاب صاحب جھینپے بہت بری طرح جھینپے۔

یوں جیسے ٹین ایجر جھینپتے ہیں۔ مجھے بڑا مزا آیا۔

پھر مَیں نے پوچھا۔

ایک بات کا پتہ ہے آپ کو

اس نے بات کا رُخ بدلا۔

کیا۔۔۔؟

شہاب صاحب نے مجھے بڑی توجہ دی۔

حیرت کی بات ہے مَیں نے کہا

''نہیں''

بولی حیرت کی بات نہیں۔ جو توجہ کا طالب نہ ہو اُسے بھرپور توجہ ملتی ہے۔

اُن کی توجہ سے تمھیں کیا ملا۔ مَیں نے پوچھا

بہت کچھ وہ بولی بہت کچھ۔ اُنھوں نے مجھے ٹرینکوءلائز کر دیا۔

میری ہنسی نکل گئی،

وہ سنجیدہ ہو گئی بولی رسی کا ایک ایک بل کھلتا ہوا محسوس ہوا مجھے۔

رسی کے بل تو جوں کے توں موجود ہیں مَیں نے کہا۔

نہیں اس نے جواب دیا۔۔ رسی کے وہ بل جو اُوپر سے نظر نہیں آتے تھے۔

مَیں نے چڑ کر کہا بی بی میں شہاب کے ساتھ تیس سال رہا ہوں۔ مجھ میں بھی شدّت ہے
شین والی شدّت نہیں شو نے والی شدّت۔ مجھ میں بھی غصہ ہے ایسا غصہ جو ڈھول اڑا دیتا ہے۔
سدھ بدھ نہیں رہتی۔ میری شدّت اور غصّے کو تو شہاب صاحب نے جذب نہ کیا۔

پتہ نہیں کیوں وہ بولی۔ پھر دفعتاً چلائی۔۔۔۔ ہاں ٹھیک تو ہے۔ آپ کے بارے میں شہاب
صاحب نے لکھا تھا کہ مفتی کی دوستی پھوڑے کی طرح ہے، جس کی ٹیسوں میں لذّت ہے۔

یاد ہے؟ اُس نے پوچھا

ہاں یاد ہے۔۔۔ مَیں نے جواب دیا۔

بولی شہاب صاحب ان ٹیسوں کی لذّت سے محروم ہونا نہیں چاہتے تھے اِس لیے اُنھوں
نے آپ کی رسی کے بل نہ کھولے۔

شہابہ کے ساتھ بحث کرنا بالکل بے کار تھا، چوں کہ بحث اُس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔

مَیں اسے کہا کرتا تھا شہابہ شادی کر لے۔

وہ قہقہہ مار کر ہنستی، کہتی مفتی جی آپ کیوں مجھے برباد کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

مَیں تو تیری آبادی کی بات کر رہا ہوں۔

نہیں نہیں آپ نہیں سمجھتے۔ میرا شادی کرنا بہت Risky ہے۔

کیا رسک ہے ۔۔۔۔؟

مَیں پوچھتا،

کہتی۔ اگر مَیں شادی کر لوں تو اِس کے دو نتیجے ہو سکتے ہیں یا تو اُس کے پرخچے اڑ جائیں
گے جو مجھ سے شادی کرے گا اور یا میرے پرخچے اڑ جائیں گے۔

اس میں تو کوئی رسک نہیں:

مَیں جواب دیتا۔

وہ قہر آلود نگاہ سے مجھے دیکھتی۔ آپ کو اس میں رسک نظر نہیں آتا۔

نہیں،

مَیں جواب دیتا۔

اگر اس کے پرخچے اڑ گئے تو تم بچ جاؤ گی، اور اگر تمھارے پرخچے اڑ گئے تو ساری مشکل ہی
حل ہو جائے گی۔ رسی کے سارے بل کھل جائیں گے، وہ کھا جانے والی نظروں سے میری طرف
دیکھتی اور کہتی۔۔۔ مفتی جی یو آر ہارٹ لیس مین۔۔۔۔ جب مَیں شہابہ کی والدہ سے کہتا کہ بی بی
اس کی شادی کر دو تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھتی کہتی۔۔۔

مفتی جی وہ کون سا مائی کا لعل ہو گا، جو اِس کا غصہ برداشت کرے گا۔

پھر وہ دن آ گیا، جب وہ مائی کا لعل اتفاقاً ان کی گلی میں داخل ہو گیا۔ اس وقت شہابہ گھر سے باہر باغیچہ میں کھڑی غصے میں چیخ چلا رہی تھی۔

شہابہ کی چیخ و پکار سن کر وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔ رُک گیا۔ دیوانہ وار اُسے دیکھنے لگا۔

شہابہ کو اُس کی دیوانگی پسند آ گئی۔

حشر کا وہ دن آ گیا، جس کا شہابہ کو خوف تھا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ دونوں کے پرخچے اڑ گئے۔ نہ مائی کا لعل رہا نہ شہابہ۔

ایک طوفان چلا۔ بنگلا دیشی طوفان جو سب کچھ بہا کر لے گیا۔ شہابہ کی تو تڑاخ۔ اس کی مَیں میں، وہ ہنٹر والی، اس کا سرکس۔ وہ تخلیق کار اس کے شعر اس کی کہانیاں، سب فنا ہو گئے۔

آج چھ سال کے بعد طوفان کا گرد غبار چھٹ رہا ہے شہابہ کے بکھرے ہوئے اعضا سمٹ رہے ہیں اس کی شخصیت کے اجزا پھر سے جڑ رہے ہیں۔ اس کی مَیں کو زبان مل رہی ہے اور تخلیق کو اظہارِ فتنہ پھر بیدار ہو رہا ہے۔

☆☆☆

سچّے جھوٹ

محمد منشا یاد

شہابہ گیلانی اُبھرتی ہوئی نہایت ٹیلینٹڈ کہانی کار ہے۔ یوں تو اُس نے نظمیں بھی لکھیں، لیکن کہانی سے اس کی رغبت زیادہ ہے۔ اُس کی افسانہ نگاری کا سفر طالب علمی کے زمانے سے شروع ہوا اور اب تک جاری ہے اُس نے ان دس گیارہ برسوں میں تیس کے قریب کہانیاں لکھیں، جو ساتھ ساتھ اَدبی رسائل میں شائع ہوتی رہیں، بعض ریڈیو سے نشر ہوئیں، کئی ایک کہانیوں پر اسے اَدبی اداروں اور سوسائٹیوں کی طرف سے انعامات بھی ملے۔ بعض کہانیاں اس نے اَدبی محفلوں میں پڑھیں اور خوب داد سمیٹی، لیکن کسی بھی اَدیب شاعر کے فن کا بلحاظ مجموعی جائزہ لینا اور اُس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا اُس وقت تک مشکل ہوتا ہے جب تک کہ اُس کا سارا یا زیادہ تر تخلیقی کام مجموعے یا کتاب کی صورت میں سامنے نہ آئے۔

شہابہ کے افسانوں کے اس پہلے مجموعے میں سترہ افسانے شامل ہیں، جن سے قارئین اور اہلِ نقد و نظر کو اس کے فن کے بارے میں رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

شہابہ کے بہت سے افسانوں کو ایک ساتھ پڑھتے ہوئے مجھے جس بات کا شدت سے احساس ہوا وہ اس کا رواں دواں زندہ اور دل کش اُسلوب ہے۔ اُس کا قلم اور ذہن ایک ساتھ تیز چلتے ہیں۔ وہ کسی جذبے کا بیان کر رہی ہو، کسی منظر یا فضا کو پیش کر رہی ہو یا کسی واقعہ کو لکھ رہی ہو اس کے لہجے اور اظہار میں تکلف تصنع اور تکلیف کا شائبہ نہیں ہوتا۔ اگر چہ بعض اوقات عجلت کا

احساس ضرور ہوتا ہے۔ وہ فرضی، تخیلاتی اور رومانوی واقعات اور کہانیوں کو بھی یوں لکھتی چلی جاتی ہے جیسے وہ اس کی ہڈ بیتی ہوں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ایک اچھی کہانی کی اوّلین خُوبی یہی ہوتی ہے کہ وہ پڑھنے والے کو سچی معلوم ہو نہ ہو جھوٹی محسوس نہ ہو۔ شاید اسی لیے شہابہ نے کتاب کا نام بھی سچے جھوٹ رکھا۔ کہانی کی یہ بہت اچھی تعریف ہے۔

دوسری بات، جو اس کی کہانیاں پڑھتے ہوئے محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ وہ ایک نہایت حساس، سوچنے والی اور دردمند خاتون ہے۔ اُس نے اپنے ماحول اور معاشرے کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا ہے۔ دوسروں کے دکھ درد کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور جہاں کہیں محرومی تکلیف اور تفریق اسے نظر آتی ہے اس نے کہانی کے ذریعے فرد اور معاشرے کے دکھوں، تکلیفوں اور محرومیوں کو بیان کیا ہے، مگر خود کو محض اظہار و بیان تک محدود نہیں رکھا اپنی سوچ اور فکر کے ذریعے مایوسی اور بد دِلی کے اندھیرے میں روشنی کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور پیدا کی ہے۔ جو مثبت اقدار پر اس کے یقین کی پختگی کی دلیل ہے، اور جو پڑھنے والوں کو بھی خوشی، طمانیت اور حوصلہ بخشتی ہے۔

شہابہ کے موضوعات میں خاصا تنوّع اور رنگا رنگی ہے۔ عام طور پر خواتین افسانہ نگاروں کے کچھ مخصوص موضوعات ہوتے ہیں، جن کا تعلق گھر اور گھر کی چار دیواری کے اندر کی دنیا سے ہوتا ہے، مگر شہابہ کسی طرح کی حدود کی پابند نہیں ہے وہ تنور والے ''ٹنڈے بشیر'' اور دور افتادہ پہاڑی جھونپڑی میں صبر و توکل سے زندگی گزارنے والے اپاہج بوڑھے کی کہانی بھی اسی اعتماد اور روانی سے بیان کرتی ہے، جس طرح اپنی سوت کا حجلہ عروسی والی بیوی کی کہانی۔ جو خالصتاً ایک ''زمانہ موضوع ہے۔

شہابہ نے چھوٹی بڑی کئی طرح کی کہانیاں لکھی ہیں۔ سماجی حقیقت نگاری کی، تخیلاتی اور رومانوی اپنی ذات کے اندر سفر کرنے کی، جگ بیتیاں ہڈ بیتیاں اور پرندوں کے حوالے سے تمثیلی انداز کی۔ بعض کہانیاں روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے مرتب ہوتی ہیں اور ایسی کہانیاں، جن میں وہ کسی نہ کسی رُوپ میں خود بھی موجود ہے زیادہ دلچسپ اور خوب صورت ہیں۔ جیسے ''ترازو'' جو ایک ویگن ڈرائیور کی بھی کہانی ہے اور ایک نوجوان لڑکی کی بھی۔ وہ لڑکی

روزانہ ایک خاص مقام سے کالج تک ویگن میں سفر کرتی ہے۔ ڈرائیور اس کا احترام کرتا ہے اور آہستہ آہستہ اسے ''اپنی چیز'' سمجھنے لگتا ہے لیکن ایک ڈرامائی سچوایشن پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک نوجوان ویگن کے ساتھ ساتھ کالج تک لڑکی کا پیچھا کرتا ہے۔ ڈرائیور نیچے اتر کر اس سے الجھ پڑتا ہے لوگ جمع ہو جاتے ہیں ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے مگر لڑکی نوجوان کو اپنا منگیتر ظاہر کر کے نہ صرف تحفظ دیتی ہے بلکہ ڈرائیور کی ''ملکیت'' سے آزادی کا اعلان کرتی ہے۔ اس طرح یہ کہانی دو عام سے کرداروں کے خاص مطالعہ کی کہانی بن جاتی ہے۔

شہابہ کی ہر کہانی کا ذائقہ مختلف ہے۔ ''مَیں + نہیں = وہ'' اپنی ذات یا وجود کے اندر اتر کر سوچی ہوئی کہانی ہے اپنے باطن سے مکالمہ۔ اندر باہر کی کشمکش کی کہانی۔ کسی روایتی پلاٹ سے بے نیاز یہ کہانی اپنے دلکش انداز بیان کی وجہ سے انوکھا ذائقہ رکھتی ہے۔

''سلیف پورٹریٹ'' ایک انعام یافتہ کہانی ہے فنکار کو بعض اوقات اپنے فن کی عظمت اور حرمت کے لیے بہت بڑی قربانی دینا پڑتی ہے یہی اس کا مرکزی خیال ہے۔ شہابہ نے بعض کہانیوں میں ماضی، تاریخ اور تہذیب کے اندر سفر کیا ہے اور ایک انسان کے ''اس پار سے'' اس پار'' تک کے ذہنی اور رومانی سفر کا احوال بیان کرتی ہیں اور کئی ان کہی حقیقتوں سے پردے اٹھاتی ہیں جیسے ''سفر'' ۔ ''بہتے پتھر'' ۔ اور ''ازل سے ابد تک'' وغیرہ۔

میلے فرشتے اور بہتے پتھر میں ہم بظاہر معمولی، گرے پڑے اور غلیظ کرداروں سے ملتے ہیں لیکن جلد ہی ان کے اندر چھپے ہوئے پاکیزہ جذبوں اور سچے انسانی رشتوں کی مہک ہمارے دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ تجدید وفا بظاہر پرندوں کی کہانی ہے مگر یہ انسانی زندگی کی ایک دلچسپ تمثیل بھی ہے۔ ''اس پار'' جنگ کی تباہ کاریوں اور ہنستے بستے گھروں اور کنبوں کے ٹوٹنے کا ہولناک منظر پیش کرتی ہے مگر اس دھواں دھواں فضا میں بھی نئے آدم وحوّا کی جھلک پڑھنے والے کا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ تہی داماں ایک فلمی اداکارہ (ہیروین) ناکام بیوی اور ایک تہہ دست ماں کی کہانی ہے جو دنیاوی آسائشوں اور گلیمر کی دنیا کو مامتا کے فطری جذبے پر ترجیح دیتی اور ایسی محرومی کا شکار ہو جاتی ہے جس کی تلافی وہ جان دے کر بھی نہیں کر سکتی۔ ''کھوٹا سکہ'' ایک ایسے تخریب کار

کے گرد گھومتی ہے، جس کا ضمیر ایک معصوم بچے کی محبت اور اپنائیت سے جاگ اٹھتا ہے۔

مَیں شہابہ کی کہانیوں کے خلاصے بیان نہیں کرنا چاہتا محض اس کی کہانیوں کی رنگارنگی اور موضوعات کی ورائٹی کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں جس کا ان چند مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے یوں وہ چاہے تو محض کسی کھنڈر عمارت کے پرانے ستون سے صدیوں پر پھیلی کہانی سنوا سکتی ہے۔ اسی لیے مَیں نے اسے ٹیلینٹڈ کہانی کار کہا۔ بہرحال اس مشورے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ عجلت کی بجائے جم کر اور زیادہ محنت اور ریاضت سے کہانیاں لکھے۔ یقیناً وہ بہت جلد فن افسانہ نگاری میں بلند نام و مقام حاصل کر لے گی۔ میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

☆☆☆

اس پار

مئی ۱۹۸۵ء

فضا میں اُداسی کا دُھواں رچا ہوا تھا۔ منظر چاروں طرف گدلا گدلا سا تھا۔۔۔ دور آسمان پر پرندے دائرے میں چکر کاٹ رہے تھے۔۔۔ درختوں کے جھلسے ہوئے تنے اُداس بیواؤں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔۔۔ جلے ہوئے ٹوٹے پھوٹے گھروں میں کہیں کہیں دُھواں۔ آہوں کی صورت فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔۔۔ بے اثر آہوں کی طرح۔۔۔ اور آسمان خاموش تھا۔۔۔ ساکت و جامد۔

چند لمحے تو اسے یوں لگا کہ جیسے وہ کسی اجنبی زمین پر اتر آیا ہو۔۔۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔۔۔ اپنی بکھری ہوئی قوت کو مجتمع کر کے اٹھنے کی کوشش کی تو درد، پورے جسم میں عفریت بن کر پھیل گیا۔ وہ پسینہ پسینہ ہو کر ہانپنے لگا۔۔۔ اس کے کپڑے گرد آلود تھے اور داہنی ٹانگ سے خون بہہ بہہ کر پیاسی زمین کے ہونٹوں پر کالی کھرنڈ جما چکا تھا۔ سارا منظر اپنی تمامتر کراہت سمیت اس کے سامنے تھا۔ اس کے گھر کا ملبہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کی مانند بکھرا پڑا تھا۔۔۔ بے حقیقت بے وجود۔

مردہ ذہن یک دم بے دار ہو گیا۔ کہاں ہیں سب لوگ؟ اس کی نظروں میں اپنے کنبے کی شکلیں گھوم گئیں۔ اس کی بیوی جس کے گالوں میں مسکراتے وقت، چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑتے تھے۔ دونوں بیٹیاں جو سارا سارا دن گھر میں کُٹ کُٹ کرتی مُرغیوں کے پیچھے بھاگتی پھرتی تھیں۔ اور بوڑھی ماں جو چولہے کے آگے بیٹھی اپنی نیم وا آنکھوں کے دیے روشن کیے کچھ نہ کچھ بنتی رہتی تھی۔

وہ جھٹکے سے اٹھا۔۔۔ٹانگ میں جیسے کسی نے گرم سلاخ پھیر دی ہو۔مگر وہ پرواہ کیے بغیر لنگڑاتا ہوا بھاگا۔۔۔اس نے ایک ایک شہتیر اٹھایا اینٹوں کے ڈھیر کھود کھود کر انگلیاں زخمی کر لیں۔۔۔نام لے لے کر پکارا۔مگر وہ چہرے نہ دکھائی دیے۔جن کی خاطر وہ جیتا تھا۔

کپڑوں کی چند اُدھ جلی دھجیاں۔۔۔ٹوٹے پھوٹے برتن اور ساز وسامان بکھرا پڑا تھا۔۔۔ ایک کونے میں وہ بھوری مرغی اوندھی پڑی تھی جس کے سر سے وہ کئی بار بیوی سے لڑ چکا تھا۔۔۔وہ کڑک مرغی اب کسی کام کی نہ تھی۔۔۔انڈے بھی نہ دیتی تھی۔اس نے کئی بار بیوی سے کہا بھی کہ اسے ذبح کر لیتے ہیں پر وہ نہ مانی۔۔۔اپنے گالوں کے گڑھے نمایاں کرتی، وہ بس یہی کہتی رہی۔۔۔''اتنا عرصہ جس کے انڈے کھائے۔۔۔اب اسے چند دن آرام سے دانہ بھی نہیں دے سکتے کیا؟''

ایک دیوار تلے نیلی اوڑھنی دکھائی دی۔اس نے پاگلوں کی طرح اس جگہ کو کھنگالا۔۔۔یہ اوڑھنی اس نے پچھلے سال شہر جانے والے دوست کے ہاتھ منگوائی تھی۔اپنی بڑی بیٹی کی فرمائش پر کتنا شوق تھا اسے نیلی اوڑھنی کا۔۔۔ ماں نے ٹوکا بھی تھا کہ قیمتی اوڑھنی ہے سنبھال کر رکھ لے۔۔۔مگر جھکی جھکی آنکھوں میں تو نئی نئی کلیاں کھلی تھیں۔۔۔سرخ سرخ گالوں پر جذبوں کا رنگ تھا تو پھر بھلا وہ نیلی اوڑھنی کیوں نہ اوڑھتی؟

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔۔اَدھ جلی اوڑھنی کی دھجیاں ہاتھوں میں لیے جانے وہ کب سے اتنی خاموشی سے رو رہا تھا زندگی میں ایسے لمحے بھی تو آتے ہیں کہ جب انسان خود اپنے آپ سے بھی شناسا نہیں رہتا۔وہ مزید وہاں رک نہ سکا حقیقت خواب سبھی کچھ ایک ڈھیر کی صورت ملیامیٹ ہو گئے تھے۔

چند قدم ہی چلا تھا کہ اس نے ٹھوکر کھائی نیچے دیکھا تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔۔۔ایک انسانی بازو ملبے کے ڈھیر تلے جھانک رہا تھا۔پھیلا ہوا ہاتھ نہ جانے کس سے کیا سوال کر رہا تھا۔۔۔وہ اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔اپنی لنگڑی ٹانگ سمیت۔۔۔سمت کا اندازہ کیے بغیر۔۔۔جانے کتنی ہی ساکت آنکھیں کتنی ہی نیلی اوڑھنیاں اس کے رستے میں آئیں، مگر وہ خالی دماغ بھاگتا

رہا۔۔۔یہاں تک کہ تاریکی کے مہربان پَروں نے اس پر اپنا سایہ کر دیا۔

آنکھ کھلی تو سورج اپنی پوری تمازت سمیت سر پر کھڑا تھا۔۔۔دور کہیں سے پرندوں کے غول دائروں میں چکر کاٹتے اس کے قریب آ گئے تھے۔۔۔ پیاس نے حلق میں اپنے پنجے گاڑ دیے۔وہ بلبلا اٹھا۔۔۔آسیب زدہ بستی اس سے کچھ فاصلے پر تھی۔۔۔ جہاں وہ پیدا ہوا۔۔۔ جہاں اس نے چلنا سیکھا۔۔۔جہاں اس نے اپنی محبت کو پایا۔۔۔وہی سرحدی بستی دشمنوں کے دیو نما ٹینکوں اور بموں نے اجاڑ دی تھی۔۔۔چند گھرانوں پر مشتمل کتنی پُرسکون جنت تھی۔سیدھے سادے لوگ۔۔۔کبھی کوئی بھولا بھٹکا شہری آ جاتا تو لوگ کتنی حیرت اور ذوق وشوق سے اس کی طلسماتی کہانیاں سنتے اور پھر رات کو جلتی لکڑیوں کے آگے بیٹھ کر تصوارت کی دُنیا میں کھو جاتے۔

''ہوسکتا ہے کہ کوئی اور بھی میری طرح زخمی گھائل کہیں پڑا ہو'' اس نے سوچا

پیاس نے اپنے پنجے پھر چبھوئے۔۔۔اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔جھاڑیاں بھی جل کر خاک ہو چکی تھیں۔دور ایک جگہ سبزہ دکھائی دے رہا تھا۔اس نے چلنے کی کوشش کی۔نقاہت سے بُرا حال تھا۔۔۔وہ ٹانگ گھسیٹتا سبز قطعے کی جانب بڑھنے لگا۔۔۔''ہوسکتا ہے وہاں کوئی دشمن چھپا بیٹھا ہو'' خوف نے آواز دی۔لیکن انسان آخری سانس کی بھی حفاظت کرتا ہے۔۔۔چاہے جینا کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو۔

پہاڑی کی ڈھلان پر چھوٹی چھوتی جھاڑیوں کے درمیان چند درخت سہمے کھڑے تھے بظاہر کسی ذی روح کا نشان تک نہ تھا۔وہاں۔۔۔دور ایک چشمہ نظر آ رہا تھا۔اسے سب کچھ بھول گیا۔۔۔گھر کا ملبہ، نیلی اوڑھنی، ٹانگ کا زخم۔۔۔اگلے ہی لمحے وہ پانی کے گھونٹ حلق سے نیچے اُتار رہا تھا، ماحول کا دُھندلا پن غائب ہوا تو قریب ہی خون آلود لباس میں ایک عورت پڑی دکھائی دی۔۔۔ ناشناسا جواں سال عورت۔۔۔ وہ سانس لے رہی تھی۔۔۔ اس نے جلدی جلدی ہاتھوں کی اوک میں پانی بھرا اور عورت کے چہرے پر چھینٹے مارنے لگا''۔۔۔اٹھو اٹھو'' اس نے بے تابانہ آنکھیں کھول دیں۔تاثرات سے عاری چند لمحے وہ اسے دیکھتی رہی۔پھر ناشناسائی کی ایک لہر ابھر کر خوف کے سمندر میں ڈوب گئی۔

''ڈرو نہیں۔ مَیں تمھارا دوست ہوں۔ میرا بھی گھر۔۔۔ سب کچھ تباہ ہو گیا ہے اس نے چند لفظوں میں اپنا دکھ سمونا چاہا۔۔۔ عورت کے دل میں چھپا ازلی جذبہ ابھر کر چہرے کی دراڑوں میں اَٹ گیا۔ اس نے زخمی بازو پر اپنا ہاتھ رکھ دیا'' ۔۔۔ آ۔۔۔ آ'' بدنصیب اپنی قوت گویائی کھو بیٹھی تھی۔

آدم اور حوا ایک بار پھر جنت بدر کر دیے گئے تھے۔ کانپتے گھسٹتے، درختوں کے قریب ایک کھنڈر میں عورت کو چھوڑ کر وہ کھانے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔۔۔ گھروں کے ملبوں سے اناج، لکڑیاں اور چند برتن اُٹھا لایا۔ ایک برتن کو پانی سے بھرنے وہ زخمی ٹانگ گھسیٹتا کھنڈر میں پہنچا، ''مَیں آگ جلاتا ہوں تم کچھ پکا لو''

''۔۔۔اوں اوں'' جواب میں عورت نے اس کی زخمی ٹانگ کی مرہم پٹی شروع کر دی۔ اس لمحے آدم کے سارے درد جاگ اٹھے۔۔۔ اسے احساس ہوا کہ وہ زخمی ہے۔ شدید زخمی۔۔۔ دکھی ہے اور رونا چاہتا ہے۔

آسیب زدہ بستی میں رات بال کھولے ناچ رہی تھی۔۔۔ وہ دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم کسی خوفناک خواب میں سانس لے رہے تھے کہ رونے کی آواز نے مرد کو چونکا دیا۔ اس نے عورت کی جانب دیکھا۔۔۔ وہ بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ اسے وہیں رہنے کا اشارہ کر کے وہ آہستگی سے اندھیرے کا حصہ بن گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک بچے کو گود میں لیے آن کھڑی ہوئی۔۔۔ مرد نے اٹھ کر بچے کو تھامنا چاہا تو عورت نے منع کر دیا۔ بھوک سے بلکتے بچے کے ہونٹوں سے دودھ بھری چھاتی لگاتے وقت اپنے سارے غم بھول گئی۔

شاید پالنے میں پڑی اپنی اس بچی کو بھی بھول گئی جس کی معصوم چیخیں۔۔۔ اس کی اپنی چیخوں کی آواز میں گم ہو گئی تھیں۔

صبح کے سورج نے بڑی حیرت کے ساتھ ان تین انسانوں کو دیکھا۔ جو غموں کی گٹھڑیاں سروں تلے رکھے بے خبر سو رہے تھے۔ یہ کھنڈر ان کی پناہ گاہ بن گیا تھا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کے نام، نسل سے ناواقف، ایک چھت تلے۔ اعتماد کے سہارے اکھٹے تھے۔ جب ہر طرف خوف کے جنگل اُگ آئیں تو سایۂ دیوار پر بھی اعتبار کرنا پڑتا ہے۔

جانے اس طرح رہتے اُنھیں دن بیتے یا صدیاں۔ ایک دن حسب معمول شام ڈھلے اپنی پناہ گاہ میں بیٹھے تھے کہ ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ مرد نے لپک کر باہر جانا چاہا تو عورت نے روک دیا ''نہ۔۔۔ نہ'' اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔۔۔ خوف تھا۔

وہ رک گیا۔۔۔ گڑگڑاہٹ قریب آتی جا رہی تھی۔ وہ دم سادھے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے رہے۔۔۔ بے یقینی کا گدھ ان کے سروں پر منڈلانے لگا۔۔۔ ''مجھے دیکھنے تو دو شاید دوست ہوں'' مرد نے سرگوشی کی اور سرک کر کھنڈر کی ٹوٹی دیوار سے جھانکنے لگا۔۔۔ وہ تیزی سے پلٹا، کھنڈر سا ویران چہرہ لیے۔۔۔ ''دشمن'' وہ بڑبڑایا۔

عورت کے چہرے پر پالنے میں پڑی بچی کی چیخیں اُبھر آئیں۔ اس نے سوئے ہوئے بچے کو چھاتی کے ساتھ چمٹا لیا۔۔۔ اور سرک کر دیوار سے جھانکا۔ لیکن فوراً ہی پلٹ آئی۔ آنکھوں میں خوشی کے شامیانے تانے۔۔۔ وہ تو اس کے اپنے لوگ تھے۔۔۔

مرد کو یوں لگا جیسے اس کا گھر ایک بار پھر ملبے کا ڈھیر بن گیا ہو۔۔۔ نیلی اوڑھنی کی دھجیاں گالوں کے گڑھے پھر سے گڈمڈ ہونے لگے۔۔۔ وہ دونوں ایک بار پھر بے یقینی کے گدھ کے پَروں تلے بیٹھ گئے۔

نسلوں کے، ناموں کے بھوت ان کے اردگرد ناچنے لگے۔ اچانک بچے کے رونے کی آواز نے جیسے دونوں کو جھنجھوڑ دیا ساکت نگاہوں میں گزرے لمحوں کی پہچان جاگ اٹھی۔۔۔ عورت نے بچے کے منہ سے دودھ بھری چھاتی لگاتے ہوئے، مرد کی جانب اپنائیت بھری مسکراہٹ اچھالی۔

اور بے یقینی کا گدھ، مایوس ہو کر پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔

☆☆☆

بن باندھے بندھن

۱۹۸۰ء

بھرے پرے شہر کا یہ چوک بھی کچھ عجیب سا تھا۔ چاروں طرف سے سانپ کی طرح بل کھاتی کالی سڑکیں آ کر ایک دوسرے کو یہاں نگلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں---چوک کے تینوں طرف بلند و بالا بنگلے تھے---مگر ایک طرف کھلا سا کچا میدان تھا---میدان کی ایک دیوار کے قریب چھوٹا سا چھپر تھا، اور چھپر تلے ایک تنور---گرمیوں کی کڑی تیز دُھوپ اور سردیوں کی یخ بستہ ہوائیں جانے کب سے اس چھپر کے خلاف نبرد آزما تھیں---مگر خوف کے مارے جھک جانے والے یہ چھپر ٹوٹا نہ تھا۔

تنور کی ایک جانب برگد کا ایک بوڑھا درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا---لیکن کسی سوتیلی ماں کی طرح اس کی بانہیں تنور کی بجائے۔ چمکتے دمکتے گھروں کی جانب وا تھیں---محلّے بھر کے لڑکے اور بچے، بجائے دور بازار میں جانے کے یہیں آ کر روٹیاں لگوانے بیٹھ جاتے---اور ہنسی مذاق کا دور چل نکلتا---بانس اور سرکنڈوں سے بنے ہوئے چھپر تلے مٹی کا تنور، پانی کا ایک گھڑا---دو ٹوٹی سی چارپائیاں اور ایک کرسی۔ ''بشیر ٹنڈے'' کی کل کائنات تھی۔ ایک چھوٹی سی تاریک کوٹھڑی میں اس کی بیٹی رہتی تھی جو شعور کی وادی میں قدم رکھ چکی تھی۔

تنور والا ''بشیر ٹنڈا'' کیوں کر مشہور ہوا۔ یہ تو شاید کوئی بھی صحیح طرح نہ جانتا تھا۔ لیکن اس کا ایک بازو کہنی تک غائب تھا۔ اس کے باوجود حیرت انگیز پُھرتی کے ساتھ روٹیاں بناتا تھا---ہر قد و قامت اور ہر مزاج کے لوگوں کا یہاں صبح و شام میلہ سا لگا رہتا تھا۔ بچوں اور نوجوان لڑکوں کی

باتوں سے محفوظ ہو کر بشیر ہنستا تو بھاری بھرکم پیٹ عجیب انداز سے ہلا کرتا تھا---چکنے سر پر بال کم تھے، اور پسینے کے قطرے بے شمار---وہ ان عام سے غریب لوگوں میں سے ایک تھا جو ہر گلی اور ہر موڑ پر مل جاتے ہیں۔ لیکن اس کی نمایاں خصوصیت اس کے چہرے پہ معصوم سی مسرت اور شفقت کا ایک انوکھا امتزاج تھا---جب کبھی اس کی بیٹی دوپٹہ اوڑھے---سر جھکائے کوٹھڑی سے پانی کے گھڑے کے پاس آتی تو یک لخت بشیر کے دل کی رفتار سُست پڑ جاتی، اور اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کرب میں ڈھل جاتی۔ لیکن اگلے لمحے وہ چہرے پر بشاشت پیدا کرتے ہوئے کسی بچے سے کوئی مذاق کرتا اور کسی کو احساس تک نہ ہوتا کہ اس کے اندر کیا ہلچل برپا ہے۔

بچوں کے ہجوم میں ایک ننھی سی بچی بھی شامل تھی، جو اپنے کٹے ہوئے چھوٹے چھوٹے بالوں کو جھٹکتی ہوئی، تیز تیز آتی، تیز تیز باتیں کرتی ہوئی---سب کو دھکیلتی اور اپنا آٹا سب سے آگے رکھ دیتی---سب بچے ہلا گلا مچاتے لیکن بشیر---''کوئی گل نہیں کا کی ہے بچاری لڑکو'' کہہ کر اس کے آتے کی روٹیاں لگانے لگتا---

بچی فراک کے دامن سے پسینہ پونچھتی---اپنے پھولے پھولے گالوں میں پڑتے گڑھے نمایاں کرتی اور سب کو فاتحانہ نظروں سے دیکھتی---چند ایک لڑکے تو اس سے باقاعدہ خار کھانے لگے---''نہ جانے کہاں سے آ جاتی ہے موٹی---ہماری باری لے جاتی ہے''---پر اس بچی کو تو جیسے مزہ آتا تھا---وہ آ کر تنور کے کنارے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاتی اور بشیر سے دُنیا جہان کی باتیں کیا کرتی---اکثر بشیر اسے اندر کوٹھڑی میں بھیج دیتا---اور ساتھ ہی اپنی بیٹی کو آواز دیتا---''بلو---کا کی کو ٹھنڈا پانی پلا اور کچھ کھلا بھی دے---''

اس ننھی سی بچی کو بھی وہاں جا کر عجیب سا سکون ملتا تھا---دوسرے بچوں کی چھیڑ چھاڑ کی پرواہ کیے بغیر وہ رسان کے ساتھ بشیر کے گھرانے کے درمیان بیٹھتی---گرمیوں کی شدید لُو میں جب لوگ کبھی گھر سے نکلنا عذاب سمجھتے، کا کی اپنی ننھی ننھی چپلیں گھسیٹتی بھاگم بھاگ تنور پر پہنچ جاتی---دھوپ کی تمازت سے اس کے سرخ رخسار دیکھ کر بشیر گھبرا جاتا---وہ کسی کی بھی نہ [illegible]---گھر والے چیختے چلاتے رہ جاتے---مگر اسے تو جنون سا تھا، تنور کے کنارے پاؤں لٹکا

کر بیٹھنے کا۔۔۔ اکثر بشیر دوسرے بچوں کی نظر بچا کر کا کی کے ہاتھوں میں چھوٹا سا لفافہ تھما دیتا۔۔۔ دونوں کے چہروں پر معنی خیز سی مسکراہٹ اُبھر آتی اور کا کی جھپاک سے کوٹھڑی کے اندر ہوتی۔۔۔ وہاں بیٹھ کر وہ مزے لے لے کر شہتوت اور جامن کھاتی۔۔۔ جو بشیر اس کے لیے جانے کہاں کہاں سے توڑ کر لایا کرتا تھا۔۔۔ جانے بشیر کے ہاتھوں، راز داری سے لیے ہوئے ان جامنوں میں کیا لذّت تھی۔۔۔ یہ تو اس کا ننھا سا ذہن کبھی نہ جان پایا۔۔۔ ایک دفعہ کسی لڑکے نے اسے چڑانے کی خاطر بشیر کو "بشیر ٹنڈا" کہہ دیا تو اُس نے رُو رُو کر اپنی دوستوں کو اکٹھا کیا۔۔۔ اور سب سے اس لڑکے کی ٹھکائی کروائی۔۔۔ تب کہیں جا کر اسے سکون ملا۔۔۔

بشیر تک کسی نے یہ بات پہنچائی تو اس کا ہنستا ہوا چہرہ تڑخ کر جیسے ریزہ ریزہ ہو گیا۔۔۔ پھر ایک دَم سے نہ جانے کیا ہوا کہ اپنے ہاتھ سے روٹی تختے پر پٹخ کر وہ بھل بھل کرتے آنسوؤں کو چھپاتا کوٹھڑی میں گھس گیا۔۔۔ کا کی کا معصوم ذہن ان آنسوؤں کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا اور وہ صرف حیرت سے تکتی ہی رہ گئی۔۔۔ اگلے دن وہی بشیر تھا اور وہی اس کا روّیہ۔۔۔ کا کی نے اس سے رونے کا سبب پوچھا تو بشیر نے اپنے لرزتے کانپتے اکلوتے ہاتھ کو اس کے سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔ "نہ کا کی، بچے ایسی باتیں نہیں سوچتے۔۔۔ غریبوں سے اتنا پیار نہ ڈالا کر۔۔۔"

پھر وقت کے ساتھ کا کی بھی بڑی ہوتی چلی گئی۔۔۔ توے پر روٹیاں ڈالتے ہوئے شدّت سے اُس کا جی چاہتا کہ وہ بھاگ کر تنور پر جائے۔۔۔ مگر وہ صرف سوچ کر رہ جاتی۔۔۔ کبھی کبھار جب وہ راستے سے گزرتے ہوئے چند لمحوں کے لیے بشیر کے تنور پر رکتی تو بشیر کی نگاہوں میں دیپ سے جل اٹھتے۔ اُس کا ہاتھ اکثر بے اختیار کسی ننھے سے لفافے کی تلاش میں گدڑی کی جانب بڑھتا۔۔۔ وہ بس اتنا پوچھتا۔۔۔ "کا کی خیر تو ہے۔۔۔ کیسی ہو۔۔۔" یہ سن کر کا کی ڈبڈبائی نظروں سے آسمان کو تکتی۔۔۔ جیسے بیتے لمحوں کا پیچھا کرنا چاہتی ہو۔۔۔ لمحے جو بے حد ظالم ہوتے ہیں۔۔۔ جو ہماری زندگی کی کتنی ہی معصوم اور سچی خوشیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہم سے دُور ہوتے چلے جاتے ہیں اور۔۔۔ ہم صرف ان کے نقشِ پا کو ہی دیکھتے رہ جاتے ہیں۔۔۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ کا کی شہر چھوڑ گئی۔ جاتے سمے وہ چاہتے ہوئے بھی بشیر سے نہ مل

سکی۔ بشیر کے استفسار پر کسی نے اسے بتایا تو اس نے خالی خالی نظروں سے اس شخص کی جانب دیکھا۔۔۔ "کا کی چلی گئی ہے یہاں سے۔۔۔؟" وہ ہولے سے بڑبڑایا۔۔۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کئی دن تک اس کا تنور ٹھنڈا رہا۔۔۔ لیکن پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے اسے اپنا تنور جلانا ہی پڑا۔۔۔ بخار سے تپتا بدن لیے جب وہ تنور پر آ کر بیٹھا تو کا کی والی مخصوص جگہ دیکھ کر اسے یوں لگا کہ جیسے وہ ہمیشہ کی طرح وہاں پاؤں لٹکا کر بیٹھی ہو۔۔۔ اپنے اشکوں کو چھپانے کی خاطر وہ آگ پر جھک گیا۔۔۔ سرخ شعلوں کا عکس اس کے چہرے پر عجیب سا تقدّس پیدا کر رہا تھا۔۔۔ یہ رُوحوں کے پُر اسرار سے بندھن جانے کہاں۔۔۔ کس سے اور کیسے بندھ جاتے ہیں؟۔۔۔ کوئی بھی تو نہ جان پایا آج تک۔۔۔ پر بشیر کی کا کی بھی تو اسے نہ بھول پائی۔۔۔ وہ جہاں بھی رہی۔۔۔ کسی بھی تنور کو دیکھ کر اس کے قدم سُست پڑ جاتے۔۔۔ ایک میزبان اور شفیق سا چہرہ۔۔۔ یادوں کے دریچوں سے جھانکنے لگا۔۔۔

اور ایک دِن۔۔۔ جب نو سال کے طویل عرصے کے بعد۔۔۔ وہ انھی جانی پہچانی راہوں سے گزری تو بے اختیار اس کے قدم اسی چوک کی جانب بڑھے۔۔۔ لیکن یہ کیا؟

اس کچے تنور کی جگہ ایک ریستوران تھا۔۔۔ اس کچی اور سوندھی مٹی میں محبت کی، خلوص کی مہک شامل تھی۔ وہ مہک تو اب ٹین کی سرد دیواروں سے ٹکرا کر فنا ہو چکی تھی۔

کا کی کے دل میں ایک ہلکا سا چھناکا ہوا۔۔۔ جس کی آواز قریب سے گزرنے والی کار کے ہارن میں دَب گئی۔۔۔ اس کا جی چاہا کہ کسی سے بشیر کی بابت معلوم کرے۔۔۔ مگر نہیں۔

ایسا نہ ہو کہ کسی آخری اُمید کا جو ننھا سا دیا دل کے کسی کونے میں روشن ہے۔ وہ بھی بجھ جائے۔ روشنی ہلکی ہی سہی۔ موجود تو ہے نا!

اس روشنی کا وجود تو کتنی ہی لرزتی کانپتی، معصوم سی تمناؤں کے وجود کا امین ہے۔۔۔ یہی سوچ کر اس کے قدم مخالف سمت میں اٹھنے لگے اور اس کی یادوں کا محور۔۔۔ وہ چوک۔۔۔ اس کے بچپن کی طرح۔۔۔ لمحہ بہ لمحہ اس سے دُور ہوتا چلا گیا۔۔۔

☆☆☆

ادھورا آدم

ستمبر ۱۹۸۶ء

اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ بوجھل فضا میں اس کا دم گھٹ رہا تھا مگر وہ اپنی چیخیں ضبط کیے ہوئے تھی۔ اپنے وجود کو دُنیا سے چھپانا چاہتی تھی مگر یوں لگتا تھا۔ جیسے اس کے اپنے وجود پر ہی ہزاروں آنکھیں اُگ آئی ہوں۔ جیسے ساری دُنیا اس کے راز سے واقف ہوگئی ہو۔

جب اپنے راز خود پر آشکار ہو جائیں تو انسان کتنا ننگا سا ہو جاتا ہے اپنی ہی نظروں میں گر جاتا ہے۔ اپنی پاش پاش انا کی کرچیاں چنتے چنتے زخمی ہو جاتا ہے۔ بھلے دُنیا جانے نہ جانے! اور آدم و حوّا کے رشتے میں تو ایسے کئی راز ننگے ہو جاتے ہیں۔ کب تک وہ چھپاتی خود سے؟ چار دیواری سے بنے مکان کو تو چار دیواری نہیں کہتے نا؟ چار دیواری کا تحفّظ کچھ اور شے ہے۔ ایک ایسا احساس، جو کھلے آسمان تلے بھی سائبان بنا رہے۔ اسے کچھ علم نہ تھا۔ وہ انجانے ہی میں۔۔۔ غیر محسوس طریقے سے، دو ٹکڑوں میں بٹ جا رہی تھی۔ اس کے وجود کا ایک حصہ محض چار دیواری کو ہی اپنی پناہ گاہ جان کر چُپ کی چادر تان لیتا تھا۔ جب کہ دوسرا حصہ سرکش تھا۔ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ شور کرتا تھا اس دھوکے کے خلاف، جو اسی کے وجود میں پرورش پا رہا تھا۔ وہ لڑلڑ کر تھک سی گئی تھی۔ اپنے شوریدہ سر باغی وجود کے خلاف جو اس کا سکھ چین غارت کرنے پر تلا تھا۔ خواہ جھوٹا ہی سہی۔ ایک سپنا ایک سراب تو تھا زندہ رہنے کو! اور یہ آدھا باغی وجود نہ جانے کیوں اس سپنے کو توڑنے پر تلا بیٹھا تھا۔

وہ تو حوّا تھی، حوّا جو ہمیشہ ہی سے آدم کو بہکانے کے جرم میں بہکائی جاتی رہی۔ شاید آدم

جنت بدر کیے جانے کا دُکھ نہ بھول پایا تھا۔ ابھی تک! وہ بھی جان بوجھ کر ہمیشہ کی طرح آنکھیں بند کیے بہکتی رہی کہ اسی میں اس کی بھلائی تھی۔۔۔ بھوکے بھیڑیوں سے بچنے کا۔۔۔ کانٹوں بھرے جنگل میں رستہ تلاشنے کا ایک یہی حیلہ تھا۔ آدم کی قید!! وہ اس قید میں خوش تھی کہ یہی راہ نجات تھی۔ اسے یہی سکھایا گیا تھا مگر حوّا کے وجود کا آدھا سرکش حصہ، ٹیڑھی پسلی کے خم سے بنا تھا۔ ابھی تک ہار سے انکاری تھا۔

وہ آدم جس کے مضبوط بازوؤں کو بادباں سمجھ کر اس نے اپنی کشتی موجوں کے حوالے کر دی تھی۔ محض ایک بوسیدہ کپڑے کا ٹکڑا نکلا۔ ہوا کے ایک ہی تھپیڑے سے لیر لیر ہو گیا۔ اور حوّا۔ اس لیر لیر ٹکڑے کو دامن میں سمیٹے آگے بڑھتی گئی۔ تند و تیز موجوں سے لڑتی رہی کہ ازل سے یہی اس کا مقدر تھا۔ دیواروں کے اندر۔ آدم اس سے اپنا ازلی رشتہ قائم کر لیتا تھا۔ لیکن دیواروں کے اس پار۔۔۔ وہ بھول جاتا کہ حوّا اس کی پناہ میں ہے۔۔۔ اس کی امان میں ہے۔۔۔ کاغذی پھولوں سے بے رنگ الفاظ وہ دن رات اس پر نچھاور کرتا رہتا۔۔۔ بن بو۔۔۔ بن باس۔۔۔ اور وہ ان الفاظ کو چن چن کر اپنے آدھے مطیع حصے کے حوالے کرتی رہی، جو زندہ ہی ان جھوٹے الفاظ کے سہارے تھا۔

مگر آدھا باغی وجود بھوک سے بلک رہا تھا۔۔۔ تڑپ رہا تھا۔۔۔ اس کی خوارک کہاں تھی؟۔۔۔ کہاں تھے وہ جذبے؟ جو جسم کے حصار سے باہر بھی کچھ معنی رکھتے ہیں۔۔۔ کہاں تھے وہ ان کہے بول، جو نگاہوں کی زبانی سنے اور سمجھے جاتے ہیں؟ اس کشمکش نے حوّا کو نڈھال کر دیا تھا۔ مگر آدم بے نیاز تھا۔۔۔ اپنی دُنیا۔۔۔ اپنے اصولوں میں گم تھا کہ اس کے خیال میں حوّا کو یہی کچھ تو چاہیے تھا۔۔۔ چار دیواریں، تن پر چند کپڑے اور جسم کے دوزخ کا ایندھن۔۔۔ مگر حوّا کے لیے یہ کافی نہ تھا۔۔۔ اس نے تو آدم کے سارے دُکھ بانٹ لیے تھے۔۔۔ چار دیواری کا سائبان، کھلے آسمان تلے اس کے سر پر نہ تھا۔۔۔ پر وہ جلتی دُھوپ میں سفر کرتی رہی۔۔۔ زندگی کے تقاضے نبھاتی رہی۔۔۔ بھوکے بھیڑیوں اور گھنے جنگلوں کے درمیان اپنے لیے راستے بناتی رہی۔۔۔ اس نے کبھی بھی نظر اٹھا کر جلتی دُھوپ کی جانب نہ دیکھا۔ زمین پر نظریں جمائے، وہ

خود کو کھلی آنکھوں دُھوکا دیتی رہی کہ اس کے سر پر چادر ہے۔ حتیٰ کہ کی دُھوپ کی تیز اَنی اُس کے اندر اتنی دُور چلی گئی کہ رُوح تک تڑخ گئی۔

رُوح میں دراڑیں پڑیں تو وہ چونک اٹھی۔۔۔ ''کیا میرا آخری اثاثہ۔۔۔ میری رُوح میرا باغی وجود۔۔۔ جس سے محبت کا حق مَیں نے خود سے بھی چھپا کر رکھا تھا، مجھ سے چھن جائے گا؟۔۔۔ نہیں ایسا مت کرو۔ ورنہ قہر نازل ہو جائے گا۔ یہ زمین بانجھ ہو جائے گی۔۔۔ محبت اور انسانیت کی بستیاں اجڑ جائیں گی'' وہ چلاتی رہی۔۔۔ مگر دُھوپ کی تیز اَنی۔۔۔ اندر ہی اندر۔۔۔ دُور کہیں رُوح کے آر پار ہو گئی۔۔۔ حوّا کے جذبوں اور خود فریبیوں سے لپٹی چار دیواریں۔۔۔ دھڑام سے اس پر آن گریں۔۔۔ گھٹن لمحہ بہ لمحہ اس کے سانس نگلنے لگی۔۔۔ وہ حوّا جو اپنے منقسم وجود کو گھسیٹتی، آدم کو سکھ دیتی رہی۔۔۔ صرف اس جرم کی پاداش میں چار دیواروں تلے دبا دی گئی کہ وہ آدم کی نسل نہ بڑھا سکی تھی۔۔۔

وہ آدم جو ایک حوّا کو سمیٹ کر ''ایک'' نہ کر سکا ایک دوسری حوّا کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے لیے لے آیا۔۔۔ کہ ''ادھورا آدم'' زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا نا!

☆☆☆

میلے فرشتے

۱۹۸۴

اماں پلنگ پر پڑی ہائے ہائے کر رہی تھی۔۔۔ رابعہ کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر اس کمرے سے نکل جائے۔۔۔ گھر کی دہلیز پار کر جائے۔۔۔ جانے کیوں اسے اماں سے ہمدردی کی بجائے، الٹا اس پر غصہ آ رہا تھا۔

زرد رُو۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ۔۔۔ اماں! جس کے کھچڑی بالوں نے سوکھی ہوئی توری کے سے جھانوے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ آنکھوں میں مردَنی اور ہونٹوں پر پپڑیاں۔۔۔

''ربو۔۔۔ اری او ربو۔۔۔ ذرا پانی تو پلا دے حلق سوکھ رہا ہے''

اماں کی کمزور منمناتی سی آواز نے رابعہ کو مزید چڑا دیا۔۔۔ وہ بڑ بڑ کرتی اٹھی۔۔۔ گھڑے سے پانی انڈیلا اور اماں کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔۔۔ ''لے پانی پی لے'' اماں نے رحم طلب نظروں سے رابعہ کی جانب دیکھا۔۔۔ ''تو ہی پلا دے نا۔۔۔ ذرا سہارا دے دے'' ''ہاں لے'' رابعہ نے طوعاً و کرہاً اماں کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر ٹھک سے اسے اونچا کیا اور گلاس اس کے منہ میں ٹھونس دیا جیسے۔۔۔ ''ربو۔ ذرا آہستہ'' اماں نے التجا کی، مگر رابعہ تو جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ وہی اماں جس کی ذرا سی تکلیف پر ننھی ربو کے آنسو نہ تھمتے تھے، آج خشک آنکھوں سے پٹاپٹ اماں کو ہائے ہائے کرتے دیکھتی اور انجان بنی رہتی۔

اماں بے چاری جانتے۔۔۔ دیکھتے چُپ سادھے رہتی کہ جوان بیٹی سے ایسے موضوع پر کیا بات کرے۔ کیسے سمجھائے اسے۔۔۔ الٹا وہ بے چاری تو رابعہ کی ہر جھنجھلاہٹ اور غصے کو نرمی سے

مٹانے کی کوشش کرتی۔اس پر رابعہ مزید سر چڑھتی جا رہی تھی۔۔۔شعلہ بنی جا رہی تھی۔

ایک تو طوفانی عمر۔۔۔دوسرا مسئلہ ایسا تھا کہ اماں بے چاری نہ کوئی صفائی پیش کر سکتی تھی اور نہ ہی کسی کو الزام دے سکتی تھی۔رابعہ کے من میں تو جیسے لاوا کھول رہا تھا۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ سارے گھر کو آگ لگا دے۔۔۔نہ جانے کیوں وہ اتنی حساس ہو گئی تھی۔اس معاملے میں؟ بات اتنی بڑی بھی نہ تھی۔۔۔غریب گھروں میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔۔۔۔ہر سال ایک نیا بچہ۔۔۔ایک یہی ترقی تو بغیر کسی سفارش، بغیر کسی رشوت کے غریبوں کو نصیب ہوتی رہتی ہے۔

حسین چاچا کے دس بچے تھے آگے پیچھے۔۔۔خالہ صغریٰ کے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں اوپر تلے۔۔۔پیچھے والے حشمت دین کی ابھی سے چار بیٹیاں تھی۔۔۔تو پھر اللہ جانے یہ رابعہ نے کیوں ناک چڑھانا شروع کر دیا پہلے ایک دو بہن بھائی کا آنا تو اسے اچھا لگا۔۔۔گود میں لیے لیے پھرتی۔۔۔نہلاتی دھلاتی۔۔۔اماں کا ہاتھ بٹاتی۔۔۔مگر جب سے نمبر چھ اور نمبر سات کی آمد ہوئی۔۔۔رابعہ کی تو کھوپڑی الٹ گئی۔اس نے کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر دیا۔

ذرا ذرا سی بات پر اماں سے اُلجھ پڑتی۔۔۔ریں ریں کرتے بہن بھائیوں کو پرے دھکیل دیتی۔۔۔''اُنھیں خود ہی سنبھالو اماں۔کس نے کہا تھا کہ ڈھیر سارے بچے پیدا کر لو'' وہ بڑبڑاتی تو اماں مسکین بنی خوف کے مارے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیتی کہ کوئی ایسی بات سن تو نہیں رہا۔۔۔''تیرے باپ نے سن لیا تو کیا کہے گا۔کچھ شرم کر جوان لڑکی کے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔۔۔''

''تو تم لوگوں کو کب شرم آئے گی۔۔۔'' وہ تڑ سے جواب دیتی۔اماں۔سیدھی سادی عورت پلّو سے چہرہ ڈھانپ کر استغفار پڑھنے لگتی''۔۔۔جانے یہ کیا رنگ لگائے'' اس کا دل دہل جاتا۔ رابعہ تو سترہ سال ہی میں ایک دم جوان ہو گئی تھی۔سوکھی سڑی کھا کر بھی اٹھان ایسی تھی کہ لوگ مڑ مڑ کر دیکھتے تھے۔۔۔اس پہ طرح یہ کہ شکل سب بہن بھائیوں میں اچھی تھی۔۔۔جس پر وہ اتراتی بھی تھی کچھ۔۔۔اور پچھلے چند مہینوں سے اس کی زبان اس قدر تیزی سے چلنے لگی تھی کہ اماں کو اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر نے اَدھ مواء کر دیا تھا۔وہ تو خود کو بڑھیا تصور کرنے لگی تھی۔مگر اس کے

بوڑھی ہو جانے سے کیا ہوتا تھا؟۔۔۔رابعہ کا باپ خیرو تو ابھی تک خود کو جوان سمجھتا تھا۔صبح سویرے مونچھوں کو تیل سے چپڑ کر بل دیتا۔سارا دن کارخانے میں بک بک جھک جھک کے بعد رات گئے آن پڑ رہتا۔۔۔اسے تو رابعہ کی جوانی کی خبر ہی نہ ہوتی۔۔۔اگر رابعہ کی ماں ساتویں بچے کی پیدائش پر اسے سرگوشی میں نہ کہتی ''اب تو رابعہ بیاہنے جوگی ہو گئی ہے۔۔۔اب اس کی کچھ فکر کرو۔۔۔''

صبح خیرو نے غور سے رابعہ کو دیکھا۔۔۔اس کی مونچھ کا بَل ڈھیلا سا پڑ گیا۔۔۔اور وہ تیل چپڑے بغیر گھر سے نکل گیا۔شام کو بھی جلد ہی گھر واپس آ گیا۔۔۔ابھی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ رابعہ کی آواز کان میں پڑی۔۔۔وہ ماں سے لڑ رہی تھی شاید ''گھر میں کھانے کو پورا نہیں پڑتا اور تم ہو کہ پیدا کیے جا رہی ہو۔۔۔'' اور خیرو وہیں سے اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔۔۔رات گئے تک وہ شاہ جی کی دکان پر بیٹھا حقہ سلگاتا رہا۔۔۔''کیا واقعی رابعہ اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ۔۔۔؟'' اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔س

کوئی نہ جانتا تھا کہ رابعہ کا دماغ اتنی اونچی پرواز کیوں کرنے لگا ہے؟ وہ اتنی صفائی پسند اور غصیل کیوں ہوتی جا رہی ہے؟ دراصل ساری خرابی اس پیلے چوبارے نے پیدا کی تھی۔ جہاں رابعہ کام کرنے جاتی تھی۔کتنا صاف ستھرا تھا وہ گھر!۔۔۔بس دو ہی بہنیں۔سجی بنی گڑیا جیسی۔۔۔سارا دن گھومتیں۔۔۔کتابیں پڑھتیں۔۔۔میٹھے میٹھے لہجوں میں فون پر باتیں کرتیں اور زندگی کا لطف اٹھاتیں۔چھوٹی رعنا تو سکول جاتی تھی۔ جب کہ سبیتا کالج سے فارغ ہو چکی تھی۔ وہ اکثر رابعہ سے گپ شپ لڑاتی۔رابعہ اس کے کمرے کو، کپڑوں کو اور کتابوں کو حسرت سے دیکھتی۔اس کا جی چاہتا کہ وہ یونہی اُجلے اُجلے گھر میں اُجلی اُجلی بن کر بیٹھے۔اسے اپنی غربت اور گندگی کے ذمہ دار اپنے منہ بسورتے کالے کلوٹے بہن بھائی نظر آتے۔لیکن پھر وہ سوچتی کہ سارا قصور تو اماں ابا کا ہے۔نہ کھانے کو گھر میں نہ ڈھنگ کا کپڑا لتا۔اوپر سے پیلے چوبارے والوں کے T.V پر ''کم بچے خوشحال گھرانہ'' کا اشتہار دیکھ کر تو رابعہ کو بے طرح اماں ابا پر غصہ آنے لگتا۔

وہ خود تو باجی کے ہاں سے اچھا کھانا پیٹ بھر کر کھا لیتی تھی، تبھی تو صحت اچھی تھی۔اترن بھی

مل جاتی جسے وہ سنوار سنوار کر پہنتی جبھی تو گھر آ کر سب کچھ گندہ اور بد بودار لگتا تھا اسے۔۔۔اور اب اس کینچوے جیسے کالے کلوٹے ساتویں بچے کو اماں کے پہلو میں پڑے دیکھ کر اس کا جی متلا نے لگتا تھا۔ جبھی تو اماں کی کوئی فریاد اس کا دل نہ پسیج سکتی تھی۔

جوان بیٹی کے تیوروں سے ماں خائف تھی اسے لگتا جیسے سارا قصور واقعی اس کا اپنا ہو۔۔۔ دن تو تھے رابعہ کے بیاہ کے، اور پیداوہ خود کیے جا رہی تھی۔۔۔اسے واقعی شرم آنے لگتی۔۔۔رابعہ اور شیر ہو جاتی۔

چند دنوں میں اماں مجبوراً چارپائی سے اٹھ بیٹھی اگر چہ جان نہ تھی۔۔۔مگر گھر کو بھی تو سنبھالنا تھا۔۔۔کچھ رابعہ کے جملوں سے بھی خائف تھی وہ۔۔۔کبھی کبھی رابعہ کو ترس آ جاتا۔۔۔اماں کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر۔۔۔مگر یہ لمحے زیادہ دیر پا نہ ہوتے۔

سارے بچے رابعہ کے غصّے سے ڈرتے تھے۔۔۔چھپ کر سانس روکے وہ اِدھر اُدھر کونوں کھدروں میں گھسے رہتے یا باہر گلی میں کھیلتے رہتے جہاں رابعہ کی نظران پر نہ پڑ سکے۔ کہ وہ گھر کی کماؤ پوت بھی تھی اور پھر خیرو کی دن بھر کی گھر سے غیر حاضری نے اس کی چودھراہٹ میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔۔۔شاید کڑھنے کے باعث یا تکان ہو گی۔ بہر حال چند دن کے لیے رابعہ کو بخار آ گیا۔اماں نے اسے کام پر جانے سے روک دیا ''تو کھلائے گی کہاں سے ان کو۔۔۔۔'' رابعہ نے حسبِ عادت نفرت سے منہ سکوڑ کر اپنے بد شکل بہن بھائیوں کو دیکھا۔۔۔''خیر ہے، تیرا ابا بھی تو کچھ کمائی کرتا ہے نا۔۔۔تو چند دن آرام کر لے۔ پھر چلی جانا کام پر'' اماں دبی زبان سے بولی۔

دل تو نہ چاہتا تھا اس میلے کچیلے گھر میں پورا دن گزارنے کو مگر مجبوری تھی۔ اماں بے چاری اس کے لیے پرہیزی کھانا جانے کس مصیبت سے بناتی۔ پیار سے کھلاتی۔ رابعہ کے کڑوے کسیلے جملوں کو نرم سی مسکراہٹ میں جذب کر لیتی۔ وہی ننھے منے کیڑے مکوڑے جانے کن کونوں کھدروں سے نکل کر اس کے گرد جمع ہو جاتے۔ وہ نفرت اور ترحم کے ملے جلے احساس سے آنکھیں موند لیتی۔ مریل سی آوازوں میں وہ پوچھتے ''آپا سر دبا دوں۔۔۔؟'' ایک کہتا ''پانی لا دوں۔۔۔؟'' دوسرا چادر ٹھیک کرتا۔ تیسری اپنی باتوں سے بہلانے کی کوشش کرتی۔ رابعہ کوئی

جواب دیے بغیر مردوں کی طرح پڑی رہتی۔ وہ بے چارے مایوس ہو کر آہستہ آہستہ باہر رینگ جاتے۔ چند دنوں ہی میں اس کا بخار اتر گیا۔ اماں نے شکرانے کے نفل ادا کیے۔ مریل سے کینچوؤں کے چہروں پر ہنسی آ گئی۔۔۔آنکھیں چمکنے لگیں ''آپا اب تم ٹھیک ہو گئی ہو نا؟''۔۔۔لہجوں کی محبت اور رسان بھلا کیسے چھپتا''۔۔۔آپا تو ان کے لیے کوئی دیوی تھی۔۔۔کوئی فرشتہ تھی جو ہر وقت صاف ستھری رہتی ایسی باتیں کرتی جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔۔۔اور انسان تو ہر اس چیز کا رعب قبول کر لیتا ہے جو اس کی سمجھ سے باہر ہو۔

طبیعت سنبھلتے ہی رابعہ پہلے چوبارے جا پہنچی۔۔۔وہاں کی خوش نما فضا میں اس نے سکون کا سانس لیا جیسے۔۔۔بھاگم بھاگ سبیتا کے کمرے میں جا پہنچی ''آؤ آؤ رابعہ کیسی ہو؟ اتنے دن کہاں تھیں۔۔۔؟ سبیتا بستر پر پڑی تھی شاید بیمار تھی۔ ''بخار آ گیا تھا باجی جی۔ پر اب ٹھیک ہوں'' وہ چہک کر بولی۔۔۔''مگر آپ کو کیا ہوا۔۔۔؟'' اس نے پوچھا۔

''لو ایسا لگتا ہے کہ ہم دونوں نے سانجھ کر رکھی تھی بیمار ہونے کی۔۔۔جس دن تم نہیں آئیں کام پر۔۔۔اسی دن مَیں بھی بیمار ہو گئی تھی۔ ''سبیتا نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

''ڈاکٹر کو دکھایا آپ نے باجی جی؟'' رابعہ نے ہمدردی جتلائی۔ ''ایک ڈاکٹر؟۔۔۔ ارے دس دس ڈاکٹر بلوائے پاپا نے۔'' اور ہاں مَیں تو بھول ہی گئی۔۔۔ذرا صاحب جی اور بیگم صاحب کو سلام کر آؤں۔ رابعہ اٹھنے لگی۔

''وہ گھر پر نہیں۔۔۔ضروری کام تھا۔ پرسوں سے دونوں کراچی گئے ہوئے ہیں۔۔۔'' سبیتا کی آنکھوں میں حسرت تھی۔

''مگر باجی جی آپ کو بیمار چھوڑ کر چلے گئے؟'' رابعہ سخت حیرت زدہ تھی اس کی نگاہوں میں اماں کا سراپا گھوم گیا۔۔۔جو اس کے سرہانے بیٹھی دُعائیں پھونکا کرتی۔۔۔''میرے پاس تم سب لوگ جو ہو، اور پھر اتنے ڈاکٹر جو آتے ہیں صبح و شام!''

سبیتا کے لہجے میں تنہائی اور یاس کا قبرستان بول رہا تھا۔۔۔جانے کیوں رابعہ کو پہلی دفعہ یہ صاف ستھرا کمرہ دُھندلا سا نظر آیا۔ اتنے میں رعنا اندر داخل ہوئی۔ ''کیسی ہو سبیتا ڈارلنگ۔۔۔؟''

بڑے لاڈ سے اس سے پوچھا۔۔۔ ''ٹھیک ہوں ڈارلنگ آؤ تم بیٹھو صبح سے نظر نہیں آئیں۔۔۔ سیتا نے ملتجاہانہ لہجے میں کہا۔

''ارے تم تو ایسے ہی گھبرا جاتی ہو۔۔۔ ناز کے گھر فنکشن تھا۔ صبح سے ادھر تھی اور اَب مجھے کلب جانا ہے۔۔۔ تمھارے پاس رابعہ جو آ گئی ہے Take care of yourself best of health رعنا نے سیتا کو Flying Kiss کی اور اپنے میٹھے لہجے کا شہد ٹپکاتی باہر نکل گئی۔۔۔

رابعہ کا دل ایک دم ہی گھٹنے لگا اندر۔۔ وہ باہر کی تازہ ہوا اپنے اندر اُتارنا چاہتی تھی۔۔۔ ''اچھا باجی مَیں بھی چلوں۔ آج جی اچھا نہیں،۔۔۔ کل سے آؤں گی کام پر۔۔۔'' اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہ باہر نکل گئی۔

پہلے چوبارے سے نکلتے وقت اس کے قدم من من بھر کے ہو جاتا کرتے تھے۔ مگر آج تو کوئی بڑی نرم سی ہوا سے کشاں کشاں اپنے آشیانے کی جانب لیے جا رہی تھی۔

''اری تُو اتنی جلدی لوٹ آئی۔۔۔؟'' نلکے پر میلے کچیلے کپڑوں کا ڈھیر دھوتی زرد رَوسی اماں نے حیرت سے دیکھا۔

ربو نے آہستگی سے بڑھ کر چارپائی پر پڑے اماں کے ساتویں کالے کلوٹے کینچوے کو اٹھا کر پیار کیا۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر گندے بالوں میں جذب ہو گئے۔ ''اماں مَیں کپڑے دُھو دیتی ہوں۔ دیکھ تو یہ کتنا کمزور لگ رہا ہے اور تُو بھی تھک گئی ہو گی۔ جا ذرا آرام کر لے'' ربو نے بڑی احتیاط کے ساتھ میلے فرشتے کو حیران کھڑی اماں کی بانہوں میں دیا اور اپنی صاف ستھری قمیض کی آستین چڑھا کر گندے پانی سے چھینٹے اُڑانے بیٹھ گئی۔

☆☆☆

ازل سے ابد تک

۱۹۸۰

ابھی ابھی میری آنکھ کھلی ہے۔ میرے چاروں طرف ایک عجیب سا شور برپا ہے۔ مَیں کہاں ہوں؟ دُھند بڑی گہری ہے۔ یہ بنتے مٹتے نقوش یہ وحشت زدہ سے ہیولے اور بے ہنگم سی آوازیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی اناڑی نے ستار کے تاروں پر ایک دم سے دونوں ہاتھ رکھ دیے ہوں۔ تبھی تو ان آوازوں میں ایک احتجاج ہے۔ بے بسی کا دُکھ ہے اور شاید طمانیت کی ایک ہلکی سی لَے بھی کہیں پس پردہ موجود ہے۔ یا صرف میرا واہمہ ہے۔ ہاں ہو سکتا ہے کیوں کہ اس وقت مَیں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں۔

سنو یہ چیخ کیسی ہے؟ ہاں یاد آیا۔ مَیں اپنے گھر اپنے چاہنے والوں کے درمیان ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ عورتیں بین کر رہی تھی۔ کبھی کبھار رُک کر ارد گرد کا جائزہ لیتیں اور پھر با آواز بلند چلانے لگتیں۔ میری بیوی، وہ عورت جس کے ساتھ مَیں نے زندگی کے سات برس گزارے۔ میرے قریب فرش پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سینہ کوبی کے باعث اس کا سینہ نیلا پڑ چکا تھا۔ بال بکھرائے، وہ وحشت زدہ سی اِدھر اُدھر دیکھتی تھی۔ میرے چہرے پر نظر ڈالتی اور گھبرا سی جاتی۔ موت کیسی عجیب چیز ہے؟ پل بھر میں کیا سے کیا کر دیتی ہے۔ ابھی چند دن پہلے تک تو اس کی محبت پاش نگاہیں میرے چہرے سے ہٹنے کا نام نہ لیتی تھیں اور اب۔

میرے دونوں بچے ہر قسم کی فکر سے آزاد ہجوم میں گھوم رہے تھے۔ میرے پاس آ کر وہ اپنی توتلی زبان میں ماں سے مخاطب ہوتے۔ ''امی ابو ابھی تک کیوں سو رہے ہیں۔ اُٹھیں نا ابو اُٹھوں

نے میرے جسم پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیرے'' تو میرا جی چاہا کہ واپس لوٹ جاؤں لیکن اب یہ میرے بس میں نہ تھا۔

مَیں اب دیوار کے ''اس پار'' تھا اور یہ دیوار بڑی مضبوط ہے۔ یہاں سے ''اس پار'' جانا ناممکن ہے۔ مَیں مطمئن بھی ہوں شاید تھک چکا تھا۔ زندگی کی دوڑ میں بھاگتے بھاگتے۔ میرا دم پھول سا گیا تھا۔ ہاں اچھا ہی ہوا کیوں کہ ابھی میری رُوح نڈھال نہیں ہوئی تھی۔ صرف جسم ہمت ہار بیٹھا تھا اگر رُوح بھی تھک جاتی تو دیوار کے اس پار بھی تھکن بدستور قائم رہتی۔ جسم کا کیا ہے، یہ تو ہمیشہ ہی دُھوکا دیتا رہا ہے۔ اب بھی ساتھ چھوڑ گیا میرے عزیز واحباب مجھے یہاں تنہا چھوڑ گئے ہیں۔ بہت تاریکی ہے لیکن یہ سکون کیسا ہے؟ میرے جسم کو اس گڑھے میں اُتارتے وقت کئی ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ میرے نہیں۔ اپنے انجام کے خوف سے لیکن مَیں جانتا ہوں کہ قبرستان کی حد سے نکلتے ہی وہ خود کو پھر جسم کے گہرے لبادلے میں چھپالیں گے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اُنھیں پکاروں، رُوک لوں۔ مَیں تنہا کب تک یہاں رہوں گا؟ لیکن میری آواز وہ نہیں سن سکتے تھے۔ سنا تھا کہ قبر میں فرشتے آکر حساب لیں گے۔ لیکن میرا حساب تو ابھی سے شروع ہو گیا۔ میری اپنی رُوح میرے جسم سے الگ کھڑی ہے۔ اس کے تیور بے حد خطرناک ہیں اور یہ جسم۔ کسی مجرم کی طرح خاموش پڑا ہے۔ اپنی شکنوں سمیت!

''اعتراف کرو اپنے گناہوں کا'' میری رُوح کی آواز میں کچھ ایسا اثر تھا کہ جسم کانپنے لگا۔ سوکھے سوکھے لب پھڑ پھڑائے لیکن آواز کہیں گم ہو چکی تھی۔

''اپنی زبان سے کہو۔ شاید تمھارے گناہوں کا اثر کم ہو جائے۔'' رُوح کی آواز میں اب نرمی تھی۔ میرے جسم نے جُھرجُھری سی لی۔ نحیف سی آواز میں اس نے اپنی روئیداد شروع کی۔

''مَیں پہلے بھی دیوار کے اس پار ہی تھا۔ تمھارے ساتھ اے رُوح جب مجھے ''ادھر'' بھیجا گیا تھا تو مَیں نے بہت احتجاج کیا تھا۔ تم بھی تو میرے ساتھ تھیں۔ مجھے دُنیا کی روشنی بہت خوفناک لگی تھی۔ مجھے نہ جانے کیوں احساس ہو گیا تھا کہ مَیں ان روشنیوں سے پگھل جاؤں گا۔ مَیں نے رو رو کر، چلا چلا کر فریاد کی تھی مگر مجھے دُنیا کے جہنم میں دھکیل دیا گیا۔ تب تم میرے ساتھ

ساتھ تھیں۔ مجھ سے بہت دور نہ تھیں۔ ہماری دل چسپیاں مشترک تھیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا تم مجھ سے دور ہوتی گئیں۔ میری اور تمھاری خوراک میں بڑا فرق تھا۔ ہمارا طریقۂ شکار مختلف تھا، تم مجھے اپنی جانب کھینچتی تھیں۔ پر اس صورت میں مجھے خوف تھا کہ مَیں بھوک سے مر جاؤں گا اور بھوک کا یہ خوف۔ آسیب بن کر چمٹ گیا اور مَیں تم سے دور ہوتا چلا گیا۔

اگرچہ ہمارے درمیان باریک سی ڈور۔ اپنی جگہ موجود تھی، لیکن اور بہت سی چیزیں ہمارے درمیان حائل ہو گئی تھیں۔ جو بے حد پُرکشش تھیں۔ تم اپنے پرانے رشتے بھلانے پر راضی نہ تھیں۔ اور مَیں نئی دُنیا میں نئی جنتیں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ چمکیلی طلسمی دُنیا سنہری تھی۔ یہ روشنیاں میری ہم رنگ تھیں۔ اسی لیے مَیں تمھارے پھیکے سے رنگ سے اکتا گیا تھا۔۔

مَیں نے تم سے بچنے کی خاطر کئی اصول تراشے۔ نئے نئے الفاظ وضع کیے۔ کئی بار مجھے محسوس ہوا کہ واقعی مَیں نے تمھیں بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ تم شکست کھا گئی ہو لیکن اُس وقت مَیں بہت چڑتا، جب مجھے پتہ چلتا کہ میرے الفاظ کے ریلے تمھیں بہا نہیں سکے۔ تم پھر میرے قریب آجاتی ہو۔ تو مجھے تمھارے وجود سے وحشت سی ہونے لگی۔ مَیں تم سے خائف رہنے لگا مجھے خوف تھا کہ تم مجھے مات دے دوگی۔ اس لیے مَیں ہمیشہ جھگڑے میں پہل کرتا۔ تم پر وار کرتا، لیکن میرے نشانے چوک جایا کرتے تھے۔ تم جواباً میری جانب ہلکی سی مسکراہٹ اُچھال دیتی تھیں، جو میرے بدن میں آگ سی لگا دیتی۔ مَیں پاگل ہو جاتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مَیں بہت جلد تھک گیا ہوں۔ جب کہ تم ویسی ہی تروتازہ ہو۔ سفر کے آغاز کی طرح۔ مجھے اعتراف ہے کہ مَیں نے تم پر بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ مَیں نے بارہا تمھارا گلہ گھونٹنا چاہا۔ تمھیں وحشیانہ طور پر زخمی کیا۔ چرکے لگائے۔ تمھارے دھیمے دھیمے رنگوں میں نفرتوں اور گناہوں کی دُھول ملانا چاہی۔ لیکن تم میرے سمجھ میں کبھی نہ آئیں ہمیشہ میری توقع کے خلاف ویسی ہی اُجلی اُجلی الگ کھڑی رہیں اور مَیں اپنی پھینکی ہوئی غلاظتوں میں خود ہی لت پت ہو جاتا تھا اور تم نے ہر مقام پر مجھے شکست دی۔ اس وقت مَیں اندھا تھا۔ میری آنکھوں کی جوت تو تم تھیں تم سے دور رہ کر مجھے راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مَیں بھٹک جاتا تھا لیکن آخرکار تمھاری جیت کو مَیں نے تسلیم کر لیا ہے۔ اب جو چاہے سزا دے۔ مَیں تمھارا بھی مجرم

ہوں۔ اپنے اس پار کے مکینوں کا اور اپنے دائمی گھر کا بھی۔ مَیں اپنے گھر کا رستہ بھول کر ان بازاروں میں کھو گیا جہاں سے واپسی بہت مشکل ہے۔

یہ کہہ کر میرا جسم خاموش ہو گیا۔ اضطراری کیفیت کی جگہ ازلی سکون تھا وہ چپ چاپ میری رُوح کو تک رہا تھا رُوح سوچ رہی تھی۔ اس کی اُجلی پیشانی پر پڑی شکنیں آہستہ آہستہ معدوم ہو گئیں۔ مقدّس سی مسکراہٹ اس کے رسیلے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ وفا کی شعاعوں سے رُوح بھیگ رہی تھی۔ میرا جسم اس کا پرانا ساتھی تھا آزمائش کا سفر دونوں نے اکٹھے شروع کیا تھا، رستے کی صعوبتیں بھی اکٹھے اٹھائیں تو منزل پر آ کر دوری کیسی؟ شاید یہی سوچ کر میری رُوح نے اپنے پوتر ہونٹ میرے جسم کی پیشانی پر رکھ دیے اور میری قبر کی تاریکی نورانی کرنوں سے گھبرا کر جانے کہاں چلی گئی۔

☆☆☆

سفر

اکتوبر ۱۹۸۶ء

سارا رستہ اِدھر اُدھر کی خوبصورت عمارات کو دیکھتی، ان میں بسنے والوں پر رشک کرتی، آگے پیچھے بھاگنے والی، لشک لشک کرتی کاروں پر حسرت بھری نگاہ ڈالتی ہوں۔۔۔ پر جونہی۔۔۔ دور ہجوم سا نظر آتا۔۔۔ آپ ہی آپ میرے ہاتھ اٹھتے ہیں اور۔۔۔ دوسرے ہی لمحے میرے بدن پر لپٹی چادر سے میرا سر بھی ڈھک چکا ہوتا ہے۔

گاڑی جونہی احاطے کے قریب موڑ کاٹتی ہے نہ جانے کیوں؟ اور کس جذبے کے تحت۔۔ میری آنکھیں بھر آتی ہیں۔۔۔ اور پھر یکا یک، خواہ مخواہ ہی۔۔۔ غصّے سے میرا تن بدن جھنجھنا سا جاتا ہے۔۔۔ عجیب سی کیفیت مجھے گھیر لیتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ چلا چلا کر رو دوں۔ رُکے ہوئے آنسوؤں نے اندر ہی اندر۔۔۔ ایک لاوا پیدا کر دیا ہے اور دماغ کا فیوز بھک سے اڑ چکا ہے۔

ہوش تب آتا ہے جب مَیں درگاہ کے سامنے کھڑی ہوتی ہوں۔ اردگرد، چاروں طرف چہروں کا ہجوم ہے۔ خواہشات کے بت کاندھوں پر بٹھائے، ہر چہرے کے پیچھے سے ایک دوسرا چہرہ جھانک رہا ہے۔ مَیں بھی اپنی آرزوؤں کو چادر میں چھپائے آگے بڑھ جاتی ہوں۔۔۔ ''دیکھ اللہ کے خاص بندے، مَیں آج تیرے پاس اس لیے آئی ہوں کہ سنا ہے تیری بات خدا ٹالتا نہیں۔۔۔ مَیں ٹھہری ایک گناہ گار بندی۔۔۔ شاید خدا سے رابطے میں میری کمزوریاں، میری بد اعمالیاں حائل ہو جاتی ہیں۔۔۔ تو اس رابطے کو کو بحال کر دے۔۔۔ اور دیکھ یہ ہیں میری تمنائیں''۔۔۔ مَیں چادر کا جیسے کونا اٹھا کر اپنی آرزوؤں کی محض ایک جھلک دکھاتی ہوں۔۔۔ مبادا

چادر کا بھرم نہ ٹوٹ جائے۔۔۔

ڈھیروں آنسو میرے چہرے کو بھگو دیتے ہیں۔ تصور کی آنکھ سے دیکھتی ہوں کہ وہ عجز کے مارے خدا کے آگے جھک گیا ہے۔ ''اے خدا مَیں نے تو تجھے ڈھونڈنا چاہا تھا۔ تیری تلاش میں دُنیا تیاگ دی تھی۔ مجھے اپنی طلب تو نہ تھی۔۔۔ تو نے کسی مصلحت کے تحت اپنی مخلوق کو میرا پتہ دے دیا۔۔۔ اب میری لاج رکھ لینا۔۔۔ مَیں تیرے محبوب کا غلام، اتنی بڑی ذمہ داری کے قابل تو نہ تھا۔۔۔'' پھر گمان ہوتا ہے جیسے خدا نے اسے اپنی شفیق آغوش میں سمیٹ لیا ہو۔

''اے بہن دُعا پڑھ لی ہے تو راستہ دے دو۔۔۔'' تصور ٹوٹ جاتا ہے۔ مَیں مزید بکھر جاتی ہوں۔ اب تو ضرور جاؤں گی۔ وہ مقام دیکھوں گی جہاں تو نے خدا کا قرب پایا۔ درگاہ کے باہر جوتوں کی حفاظت کرنے والا بتاتا ہے کہ جس مقام پر امام صاحب نے چلہ کاٹا تھا۔۔۔ یہاں سے کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت پر ایک پہاڑ پر واقع ہے۔۔۔ ہم چل پڑتے ہیں۔ ایک انجانی سی طاقت کھینچے جاتی ہے۔ جیسے کوئی بہت بڑا مقناطیس اوہ چون کے ننھے منے ذروں کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ مَیں بالکل خالی الذہن ہوں۔۔۔ بس چلے جا رہی ہوں۔ ایسے ہی۔۔۔ جیسے بس چلنا ہے۔ کبھی کبھی سوچ کی منڈیر پر کوئی کاگ بولنے لگتا ہے۔ کچھ الفاظ پلے پڑتے ہیں۔ کچھ نہیں پڑتے۔ مَیں چلتی جا رہی ہوں۔ میرے قریب کوئی کہتا ہے۔ ''یہاں بلندی پر سے دیکھو شہر کتنے پھیلتے جا رہے ہیں۔''

سوچ کی منڈیر پر کاگ پھر بولتا ہے۔ ''شہروں کی طرح۔ شہروں میں خواہشات بھی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ کثیف ہو کر ہانپنے لگتی ہیں اور پھر ایک دوسرے سے آکسیجن کے ماسک چھین کر زندہ رہنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن ان بلندیوں پر۔ خواہشیں سمٹ کر متوازی خط کی صورت لطیف ہو کر اوپر اٹھنے لگتی ہیں حتیٰ کہ آسمان کو چھو لیتی ہیں۔'' تو کیا اسی لیے اللہ کے چنیدہ بندے تُو نے آبادیوں سے دور ان چٹانوں میں آن بسیرا کیا؟ سانس لینے کو ہم راستے میں بنی ایک ''پرچھتی'' میں ٹک جاتے ہیں۔ سرکنڈوں سے بنی ایک چھت، جو چار لکڑیوں پر کھڑی ہے قریب ہی ایک پانی کا برتن اور چند گلاس رکھے ہیں۔ آتے جاتے مسافروں کی پیاس بجھانے کو۔۔۔ زمین پر بوری بچھائے

ایک بوڑھا بیٹھا ہے۔ سفید داڑھی، سر پر ٹوپی۔۔۔ شانت سا چہرہ بوسیدہ کپڑے اور دا ہنی ٹانگ کی جگہ گوشت کا ایک لوتھڑا۔

''بے چارہ'' رحم میری نگاہوں سے اُمڈنے لگتا ہے۔ ''پانی پئیں گے صاحب لوگ'' وہ پوچھتا ہے۔ ''ہاں بابا'' مَیں قریب ہی ڈھیر ہوتے ہوئے کہتی ہوں۔ ''بس دو گھڑی سانس درست کر کے آگے چلیں گے۔'' ''یہ تمھارے پوتا پوتی ہیں کیا؟ مَیں قریب بیٹھے ایک بچے اور بچی کے بارے میں استفسار کرتی ہوں۔

''نہیں بی بی۔۔۔ یہ تو میرے اپنے بچے ہیں۔'' وہ تنکا ہاتھ میں لیے ہوئے توڑے جا رہا ہے۔

''تم رہتے کہاں ہو؟''

''یہ نیچے پانی پار میرا گھر ہے''

''گزارا ہو جاتا ہے پانی کے پیسوں سے؟'' مَیں عادت سے مجبور اس کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کیے جا رہی ہوں۔

''بس جی شکر ہے اللہ کا۔ کپڑا لتا لوگ دے جاتے ہیں۔ جو دس بارہ روپے دن کے بنتے ہیں ان سے آٹا دال لے آتا ہوں۔ اس کا لہجہ طمانیت بھرا ہے۔

''اور یہ تمھاری ٹانگ؟'' ذہن میں ان کی پھانس آخر نکال ڈالتی ہوں۔

معصوم سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔

''یہ! یہ جی ریل کے نیچے آ کر کٹ گئی تھی۔ مَیں تب دس بارہ سال کا تھا۔''

''ہیں؟'' مَیں حیرت زدہ سی ہو کر وہ طویل فاصلہ ناپنے لگتی ہوں جو اس نے ایک ٹانگ کے ساتھ طے کیا۔

''اصل میں میری ماں سوتیلی تھی۔ گھر میں کھانے کو پورا نہ ہوتا تھا۔ گاؤں ہی کی ایک بوڑھی عورت ریل گاڑیوں میں ٹافیاں بیچا کرتی تھی۔ ترس کھا کر مجھے اپنے ساتھ دھندے پر لے جانے لگی۔ بس جی اس چکر میں ایک دن چلتی ریل گاڑی پر چڑھتے ہوئے گر پڑا۔ تب سے اسی کے سہارے چل رہا ہوں'' وہ پاس پڑی بیساکھی پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے۔

’’تو پھر یہ بچے۔ میرا مطلب ہے؟‘‘مَیں درگاہ سے زیادہ اب بابا کی کہانی میں دلچسپی لے رہی ہوں۔ ’’یہ بھی جی بس گاؤں والوں نے ادھیڑ عمری میں ایک بھلی مانس سے شادی کروادی بڑا خیال رکھتی ہے جی میرا۔‘‘

’’لیکن بابا۔۔۔ تم اتنے تھوڑے سے پیسوں میں گزارا کیسے کرتے ہو؟‘‘

بابا کے مطمئن آسودہ چہرے پر پھر مسکراہٹ کی ایک لہر ابھری ہے ’’شکر ہے سوہنے ربّ کی جی۔ بڑا اچھا وقت گزر رہا ہے۔‘‘

’’چلو بابا تم ثواب تو کماتے ہو نا۔ درگاہ آنے والوں کو پانی اور سایہ مہیا کرتے ہو۔‘‘مَیں اپنی علمیت کا رعب جماتی ہوں۔ بابا کا چہرہ عجز کے مارے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

’’پتہ نہیں جی کن گناہوں کی خدا پکڑ کر لے۔‘‘

مَیں یکا یک ہی اُٹھ کھڑی ہوتی ہوں۔ ’’ابھی بہت آگے چلنا ہے بابا راستہ اتنے نوکیلے پتھروں سے بھرا پڑا ہے کہ آرام دہ چائنیز جوتوں میں بھی کئی جگہ میری پاؤں دکھنے لگتے ہیں۔ مَیں چلے جا رہی ہوں۔ یہاں تک کہ منزل آجاتی ہے۔ مقدّس احاطے میں داخل ہونے سے پہلے مَیں اپنے نرم جوتے اُتارتے وقت سوچتی ہوں کہ اب تو نئے امپورٹڈ Juagars لینے چاہئیں۔ پہلے سب جوڑے تو اب out dated ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

تہی داماں

۱۹۸۵

دراڑوں سے اَٹے کہنہ سال دیواروں سے ہونٹوں پر شوخ رنگ، لپ سٹک کی دو تین تہیں جمانے کے بعد، اس نے بڑی بے دلی سے ٹشو پیپر اُٹھا کر دونوں ہونٹوں کے درمیان رکھ کر دبایا۔

دوبارہ لپ سٹک اُٹھا کر ہونٹوں پر تازہ تہہ جماتے ہوئے، اس نے سوچا، ’’کون کہتا ہے کہ آئینہ سچ بولتا ہے۔ آئینہ بھی ہم سب کی طرح ہے۔ خول چڑھے چہروں کے پار جھانکنے سے معذور۔ ابھی میرے اس چہرے کی داد دے رہا ہے۔ جو میک اَپ کی تہوں سے سجا سجایا، اپنی عمر سے کئی سال کم نظر آ رہا ہے۔ میک اَپ اُتار دوں تو یہی آئینہ حیرت سے چیخ پڑے گا۔ طنزیہ مسکراہٹ اس کے خوبصورت نقوش میں ہلکی سی تلخی کی ایک لہر اُبھار کر غائب ہو گئی۔

مسکارے سے پلکوں کو آخری ٹچ دینے کے بعد اس نے تنقیدی نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔ اس ڈھلتی عمر میں بھی وہ کافی خوبصورت تھی۔ سلیولیس بلاؤز، مہین ساڑھی میں سے جھلکتا جسم، تیکھے نقوش قیمتی زیوارات اور جدید ترین میک اَپ۔

’’تو یہ آپ ہیں مس دردانہ۔ اس ملک کی مشہور اداکارہ،‘‘ اس نے ایک انداز سے گردن ہلائی جو چالیس کے پیٹے میں ہونے کے باوجود بھی صفِ اوّل کی اداکارہ تھی کہ نئی اداکاراؤں کو شاید ابھی وہ گُر نہ [illegible] تھے کہ اسے چت کر سکیں۔

دو فلم سازوں اور اپنے وقت کے ٹاپ ہیرو سے شادی کے باوجود ابھی تک ’’مس‘‘ تھی کہ فلمی دُنیا میں سبھی کچھ مصنوعی لگنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ جذبات بھی!؟

کسی سیٹ کے رومنیٹک ماحول سے متاثر ہو کر وہ اور عدیل ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔ حسبِ روایت خفیہ شادی، تصدیق، تردید تصدیق کا سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ یہ شادی ختم بھی ہو گئی کہ ان کا Pair ٹوٹ چکا تھا۔ عدیل کسی اور ''سیٹ'' پر کسی نئی اداکارہ کو یقین دلا رہا تھا کہ وہ اس کی آخری محبت ہے، فلمی اور غیر فلمی دونوں۔

لیکن نہ جانے ایسا کیوں ہوا کہ چاہنے کے باوجود بھی وہ پھر کسی کے قریب نہ جا سکی۔ اپنے آپ کو بارہا یقین دلانے کے باوجود۔ وہ اپنے لاشعور کو قائل نہ کر سکی تھی کہ اسے عدیل سے وقتی محبت تھی یا شاید یکے بعد دیگرے تین شادیوں کی ناکامی سے دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو اب محبت اور شادی۔ دونوں کو بکواس گردانتی تھی۔ کسی نئے جوڑے کو دیکھ کر اس قسم کی پیش گوئیاں کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ ''دیکھنا چند ہی دن میں خمار اُتر جائے گا۔'' ''سب وقتی جذبے ہیں۔'' وغیرہ اس منفی روّیے کے باعث لوگ اس سے چڑنے لگے تھے۔ مگر اس کی بلا سے۔ وہ اس ملک کی چوٹی کی اداکارہ تھی۔ بڑے بڑے فلم ساز پروڈیوسر، اس کے گھر کے چکر لگاتے نہ تھکتے تھے۔ پبلک آج بھی اس کی فلمیں بڑے شوق سے دیکھتی تھی۔ سال میں کئی بار علالت کے سبب فارن کے چکر، کنالوں پر پھیلی آراستہ کوٹھی، نئے سے نئے ماڈل کی کاریں اسے اور کیا چاہیے تھا؟

اسے ہر وہ نعمت میسر تھی جس کے لیے بیویاں دن رات اپنے خاوندوں کو جھوکے اور کوسنے دیتی ہیں۔ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہیں۔

کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے وہ کہیں کھو جاتی تھی۔ سیٹ پر، میک اَپ رُوم میں، گھر میں، دوستوں کے درمیان، اچانک اس کی نگاہیں کسی ان دیکھی چیز پر ٹک جاتی تھیں۔ اس لمحے اس کی خوبصورت آنکھیں بے تاثیر ہو جاتی تھیں اور صرف انھی کمزور لمحوں میں اس کا چہرہ۔ ایکٹنگ کا نقاب اُتار کر اپنے ہونے کا ثبوت دیتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ یہ لمحے کسی کی گرفت میں آئیں۔ وہ سنبھل جاتی۔ "Ecuse me" دراصل مَیں کچھ بہتر محسوس نہیں کر رہی۔'' اور پھر ایک جان دار قہقہہ۔ وہ اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنے کا فن بہت اچھی طرح جانتی تھی وہ ایک پیدائشی اداکارہ تھی۔ Tip to toe اداکارہ!

وہ ایسے جرنلسٹوں سے، ایسے لوگوں سے دُور بھاگتی تھی، جو اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کرید کرید کر سوالات کریں۔ اپنے فن کی پبلسٹی کی خاطر، اداکاری کی خاطر۔ وہ گھنٹوں انٹرویو دے سکتی تھی لیکن بات جہاں نجی معاملات پر پہنچی، بڑی خوبصورتی سے ٹال دی گئی ''Excuse me دراصل'' یہ اس کا تکیہ کلام تھا ''مجھے اس وقت ایک پارٹی میں جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے پھر سہی۔'' اور اپنی مسحور کن مسکراہٹ کی آڑ لے کر وہ غائب ہو جاتی۔

کسی سر پھرے جرنلسٹ نے ایک دفعہ خبر لگائی کہ باخبر ذرائع کے مطابق میڈم رات کو بہت ڈسٹرب رہتی ہیں۔ اس خبر سے کسی قسم کا Reaction Show نہیں ہوا ''ان لوگوں کو کچھ تو چاہیے نا۔ اپنا اور اخبار کا پیٹ بھرنے کو''۔ محض اس نے اتنا کہا اور ٹال گئی۔

پھر کوئی ایسی بات نہ لکھی گئی کہ کچھ ہوتا تو لکھتے نا!۔ بستر سے اُٹھنے سے لے کر رات بستر میں جانے تک، اس کی آہٹ لینے والے کئی لوگ تھے۔ مگر کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہ دکھائی دی، نہ سنائی دی۔ حتیٰ کہ تھک ہار کر اخباروں، رسالوں نے اپنی توجہ دوسرے لوگوں کی جانب مبذول کر لی۔

وقت بہت ظالم ہے۔ اپنے خونخوار پنجوں سے اس کے چارم کو کھروچتا رہا، گھنے سیاہ بالوں پر پھپھوندی نے ڈیرے ڈالے۔ چہرے کی ملائم جلد پر مکڑی نے جالے بن دیے۔ خم دار ہونٹوں پر لپ سٹک کی تہہ کے باوجود دراڑیں نمایاں ہوتی گئیں۔ گرچہ فگر ابھی بھی آفت تھا۔ لیکن ڈھلتا شباب اور ڈھلتا سورج کب چھپتے ہیں بھلا! کہ خیرہ ہونے والی نظریں جب دیکھنے لگتی ہیں تو دُھوپ چھاؤں کا کھیل بہت جلد سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سائے لمبے ہونے لگتے ہیں اتنے لمبے کہ موت کی سیاہ چادر اور رات کی سیاہی میں کچھ فرق نظر نہیں آتا۔

سو وہی مس دردانہ کے ساتھ ہوا۔ صبح کافی دیر تک بیڈ ٹی طلب نہ کی گئی تو ملازم نے دروازہ بجایا۔ جواب ندارد۔ ہمت کر کے کھولا تو مس بستر کے قریب قیمتی قالین پر گھٹنوں میں سر دیے، سمٹی سکڑی پڑی تھی، آواز دی، ہاتھ لگایا تو لڑھک کر ایک طرف ہو گئیں۔ ایک کہرام مچ گیا۔ ٹیلیفون، تار، اخبار۔۔۔ سب حرکت میں آ گئے۔ اس اچانک موت کا سبب ہارٹ اٹیک تھا۔ کئی دن ہنگامہ رہا۔ بیانات جاری ہوئے۔ لوگوں کو مس کی جائیداد کی فکر تھی۔ کون وارث ہو گا اتنی ڈھیر ساری

دولت کا۔؟

اس سارے ہنگامے میں صرف ایک شخص ایسا تھا جو موت کے سبب اور دولت کے مصرف سے واقف تھا، وہ تھا محسن۔ وہ ملازم جس نے سب سے پہلے مس کو مردہ حالت میں دیکھا تھا اور اسے ایک ایسے راز کی حفاظت مرتے دم تک کرنا تھی، جو اس کے سوا کسی پر نہ ہویدا ہوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ البم گھوم رہی تھی جو اس کے گھٹنوں میں دبی ہوئی تھی۔ جس میں اس کے ساتھ عدیل اور ایک بچہ بھی تھا اور پھر۔ اس بچے کی ڈھیروں تصویریں قالین پر کچھ خطوط بکھرے پڑے تھے۔ کچھ نئے اور کچھ پرانے۔ دل کے روٹھ جانے کا سبب شاید مٹھی میں بند وہ خط تھا۔ جو اس کے بیٹے نے لکھا تھا۔

''امی اب تو میں نے اُردو بھی سیکھ لی ہے۔ مجھے آپ اپنے پاس بلالیں I miss you۔ کل ایک پاکستانی لڑکے نے بڑی عجیب سی بات کہی اس نے مجھے کہا کہ تم ایک Bastered لڑکے ہو، تبھی تو تمھاری ماما تمھیں اپنے پاس نہیں رکھتیں۔ امی! کیا یہ سچ ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں خود کو شوٹ کردوں گا۔ ورنہ مجھے اپنے اور ابو کے پاس بلالیں کون ہیں میرے ابو؟''

آپکا رضی عدیل

☆☆☆

لمحوں کا بہاؤ

۱۹۸۱

مصروف شاہراہ کے بائیں جانب، جو ایک گیٹ اپنی بوڑھی بانہیں وا کیے کھڑا ہے۔ اس میں داخل ہو کر اگر تم سیدھے روش پر بڑھتے چلے آؤ تو تمھارے قدموں تلے بچھے زرد پتے چر چرا کر تمھیں اپنے ہونے کا احساس دلائیں گے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اس سے بے نیاز ہو کر بڑھتے آؤ گے کیوں کہ قدموں تلے کچلی جانے والی چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہاں تو زندہ رہنے کا حق صرف اسی کو ہے جو کمزور کو کچل سکے۔

اوہ میں بہک گیا ہوں۔ ہاں تو جب تم آگے بڑھو گے تو سامنے ہی سرخ اینٹوں سے بنی چند سیڑھیاں نظر آئیں گی۔ جو سالہا سال سے سرسبز گھاس کی آغوش میں آنکھیں بند کیے پڑی ہیں۔ اس بات سے بے خبر کہ گزرتے وقت نے اپنے قدموں کے ان گنت نشانات ان کے دامن پر چھوڑ دیے ہیں۔ کبھی طوفانی ہواؤں کبھی سرد جھونکوں اور کبھی چلچلاتی دُھوپ کے ہاتھوں اور جانے کتنے ہی انسانی قدم۔ یہاں سے اُترتے چڑھتے زندگی کی بھی کئی سیڑھیاں طے کر گئے اور یہ جو تمھارے داہنے ہاتھ ایک ستون کھڑا ہے۔ اس کے قریب آ جاؤ میں تمھاری نگاہوں میں تجسّس کا سمندر موجزن دیکھ رہا ہوں۔ صبر کرو، ان نشانات اور الفاظ کی کہانی تمھیں میں ضرور سناؤں گا۔ ذرا دم لینے دو۔ بوڑھا ہو گیا ہوں نا اتنا بوجھ اُٹھائے اب تو میرے نحیف شانے تھک سے گئے ہیں۔ چاہتا ہوں کہ زمین کا پیوند ہونے سے پہلے کسی کو اپنی کہانی سنا جاؤں۔ تم سنو گے؟

تم نے اپنی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے نا! یہ زمین میری ماں ہے تمھاری ماں کا جسم تمھاری پہلی

پناہ گاہ اور اس کا وجود تمھارے وجود کا امین ہوتا ہے۔ اس طرح زمین کی کوکھ میں بکھرے ریزے پتھر میرے وجود کے امین بنے۔ تم سمجھ رہے ہو نا!؟ تمھارے ہی کئی بھائی بندوں نے مجھے اس سانچے میں ڈھالا اور تراشا۔۔۔ یوں تم میرے خالق بنے۔ تمھارا خالق تمھارے کاندھوں پر انسانیت، شرافت اور اخلاق کا بوجھ ڈال دیتا ہے جو تمھارے اپنے اصولوں کے طوق سمیت دوگنا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس بوجھ تلے تم سسک سسک کر ختم ہو جاتے ہو اور کبھی تنگ آ کر یہ طوق اُتار پھینکتے ہو۔ لیکن مَیں؟ مَیں اس عمارت کے بوجھ کو اُتار کر پھینک نہیں سکتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ مَیں خود کسی دن ہمت ہار بیٹھوں اور لڑکھڑا کر گر جاؤں۔ تم شعور کی منزلیں طے کرتے اس دُنیا کے رنگ دیکھتے کچھ چنتے اور کچھ پھینکتے چلے جاتے ہو۔ مَیں نے بھی اپنی تکمیل کے دوران انوکھے تماشے دیکھے۔

انسانی ہاتھ کتنی عجیب شے ہیں؟ جو کہیں تو دیبا و مخمل کو تھامتے ہیں کہیں تپتی دوپہروں میں جلتے پتھر کوٹتے، کہیں ساز کے تاروں سے سُر بناتے اور کہیں انسانی جسموں سے چیخیں نکالتے ہیں۔ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر کہوں کہ خدارا مجھے یہیں ختم کر دو۔ مجھے سر نہ اُٹھانے دو۔ مجھ میں سکت نہیں۔ مَیں جتنا اُونچا ہوتا جاؤں گا یہ کرتب یہ گھناؤنے کھیل میری نگاہوں کو گدلا کرتے جائیں گے، لیکن کسی نے میری ایک نہ سنی۔ تم مجھے بے جان کہتے ہو۔ میرے اندر جھانکو تو یہاں تمھیں کتنی ہی معصوم رُوحوں کا خون پسینہ گھلا نظر آئے گا۔ جب یہ شاندار عمارت بن کر تیار ہوئی تو میرا خیال تھا کہ اب ان تمام غریبوں کا نام ہوگا جو یہاں محنت کرتے رہے، مگر مَیں ششدر کھڑا رہ گیا جب میرے سینے پر چمکیلے حروف میں عمارت کے نام کے ساتھ کسی ایسے شخص کا نام لکھا گیا جسے مَیں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

وہ شخص ایک لمبی سی گاڑی میں آیا وہ اجنبی تھا۔ اس کا چہرہ بے حد اُجلا تھا اور صاف ستھرے نرم ہاتھوں والا یہ شخص تو میرا خالق نہیں تھا۔ میرے خالق تو کھردرے ہاتھوں اور دہکتے چہروں والے تھے۔

جب میرے سینے پر پڑے نقاب کو اس نے کھینچا تو تالیوں کی گونج میں مبارک سلامت کا شور اُٹھا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی صباحت پھیل گئی مجھے کراہت آنے لگی۔ تم نے کبھی اس عورت کا چہرہ دیکھا ہے، جو دوسرے کے بچے کو چھین کر اپنی اولاد کہے۔

اور پھر یہ عمارت آباد ہو گئی۔ ہر وقت چہل پہل دوڑتے اور سُست قدموں کی آوازیں کتنے ہی جگمگاتے اداس، مسکراتے اور روتے چہرے، میرے پاس سے گزرتے، اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے، یہ سب طالب علم اور اس کے اساتذہ تھے، ان میں کئی لوگ میرے بنانے والوں جیسے بھی تھے۔ جن کے ہاتھ کھدرے اور چہرے سنولائے ہوئے تھے۔ پرانے کپڑوں میں اپنی غریبی کو ناجائز اولاد کی طرح چھپائے۔ وہ رینگ رینگ کر چلتے تھے اور بعض اُجلے لوگ ان سے یوں دامن بچاتے تھے۔ جیسے وہ اُچھوت ہیں۔ کیا اونچی اونچی ذاتوں کا دور ابھی تک نہیں بیتا؟ اب تو صدیوں بیت گئیں ہر قدر بدل گئی پر یہ قدر نہ بدلی۔ جانے تم انسانوں کی بستیوں کے رواج کیسے ہیں؟ تم سن رہے ہو نا؟ ہاں غور سے سنو تا کہ تم اوروں کو بھی سنا سکو۔ کیوں کہ میری زبان کوئی نہیں سمجھتا۔ مَیں جو کچھ کہتا ہوں وہ انسانی آوازوں میں دَب جاتا ہے۔

ایک دن میری پشت سے ٹیک لگا کر کوئی بیٹھا تو مَیں چونک پڑا۔ اس کے بدن کی لرزش میری رُوح تک پہنچ رہی تھی۔ مَیں نے نیچے نگاہ کی تو ایک معصوم سی لڑکی پر نظر پڑی وہ رو رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک اور لڑکی تیز تیز قدموں سے آئی۔ ''صوفیہ خدا کے لیے گھر چلو'' ''نہیں مَیں اب اس جہنم میں نہیں جاؤں گی'' یہ کہہ کر پہلی لڑکی پھوٹ پڑی۔ دھیمی دھیمی سرگوشیوں کے بعد وہ دونوں اُٹھ کر چل دیں۔

مَیں نے پکارا تو سہی مگر اُنھوں نے میری صدا نہ سنی اور یہ افسانہ ادھورا ہی رہا۔ ایسی کتنی ہی ادھوری اور تشنہ داستانیں میرے اردگرد بکھری پڑی ہیں لیکن ان کے سرے کچھ اس طرح اُلجھ گئے ہیں کہ کوئی بھی مکمل نہیں ہونے پائی۔

اس دن مَیں تو کیا۔۔۔ یہاں کے تمام در و دیوار لرز اُٹھے تھے۔ جب یہاں کے لوگوں کی آپس میں ٹھن گئی تھی۔ علم کے نور سے محبت کی جوت جگانے والوں نے نفرت کی چنگاریاں کچھ اس طرح بھڑکائیں کہ اپنا دامن خود ہی جلا بیٹھے۔ میرے قدموں میں چند بے جان جسم پڑے خون اُگل رہے تھے اور پتھرائی ہوئی بے نور آنکھیں نہ جانے کسے دیکھ رہی تھی۔ ان جوان بے جان جسموں پر بوڑھے لرزتے آنسو برسے تو پتھر بھی رو پڑا تھا۔ مَیں بے جان ستون کیا جانوں یہ سب

کچھ کیوں ہوا، مگر اپنے ہی ہم نفسوں، اپنے ہی بھائیوں کے سینے چھلنی کرنے کا حق تو کوئی بھی قانون کوئی بھی مذہب نہیں دیتا۔

تم حیران نہ ہو۔ یہ باتیں مَیں نے تمھارے ہی ساتھیوں سے سنی ہیں، جو بڑے رسان سے مجھ سے ٹیک لگا کر گفتگو کرتے ہیں تم انسان نہ جانے کیسی مخلوق ہو۔ خود ہی موٹی موٹی کتابوں سے محبت اور اخوت کا سبق سیکھتے اور سکھاتے ہو، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو تم رُوپ بدل لیتے ہو اس وقت میٹھے الفاظ کے پھولوں کی بجائے تم زہریلے اور پتھریلے لفظوں سے ایک دوسرے کو زخمی کرتے ہو۔ کیا محبت کا لفظ صرف کہنہ سال ہونے اور دیمک کی خوراک بننے کے لیے ہے؟؟ تم شاید ناراض ہو گئے۔ مَیں نے تمھاری دُنیا کے حسین رنگ بھی دیکھے ہیں۔ چاہت کے معصوم جذبوں کی حدّت بھی میرے سرد وجود کا حصہ ہے۔ میرے بدن پر پڑی یہ خراشیں ایسے ہی دلوں کی دھڑکنوں کی امین ہیں۔ ان کی اپنی اور میری محبتوں کی نشانیاں جو مجھے اپنے سینے پر سجے طلائی حروف سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔

مَیں ان لوگوں کو بھی یاد کرتا ہوں جو اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر اپنے جگر گوشوں کو اس عمارت کے حوالے کر کے اُلٹے قدموں واپس لوٹ جاتے تھے۔ کیوں کہ ان کی موجودگی اولاد کے لیے باعثِ شرم بھی ہو سکتی تھی۔ وہ تو اس اینٹ کی طرح تھے جو زمین کی گہرائیوں میں چپ چاپ، روشنی سے محروم، عظیم عمارتوں کا بوجھ اپنے سینوں پر تھامے پڑی رہتی ہے۔ مجھے اور بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ اب تمھاری زبانی ہی کہہ دوں؟ اس عمارت کے تقدّس کو پامال کرنے والوں کو تم کیا سزا دو گے؟ جو چند سکوں کے عوض انسانیت کے سودے کرتے ہیں اور وہ کون ہیں جو اپنی مجبوریوں کے ہاتھوں بک جاتے ہیں۔ اُنھیں تم کیا نام دو گے؟ انسانوں، قوموں اور نسلوں کی اس بھٹّی کو تو صرف امن اور علم کے شعلے کی ضرورت ہے۔ ورنہ کندن بننے والے محض راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے اور جب یہ راکھ ہواؤں میں پھیلے گی تو سب اندھے ہو جائیں گے، جو جتنا اونچا ہو گا اس کے بدن سے راکھ اتنی ہی زیادہ چمٹ جائے گی۔ کہہ دو اپنی دُنیا کے لوگوں سے ان عمارتوں کو تو سچے جوہریوں کی ضرورت ہے تاجروں کی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میری کھال بھی پھٹ چکی ہے اور میرا اندر بھی

ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ سنا ہے کہ یہ عمارت اب بہت پرانی ہو گئی ہے اس سے انسانی جانوں کو خطرہ ہے سو اسے ڈھا دیا جائے گا۔ مگر کیا نئی عمارت میں انسانی جانوں اور قدروں کو ضمانت مل جائے گی تحفّظ کی "کیا تم نفرتوں کا سدّ باب کرو گے یا جدید موت کا ساماں پیدا کرو گے؟ مَیں اور یہ عمارت تو مٹ جائیں گے لیکن ان فضاؤں میں بسنے والی گونج کبھی نہ مرے گی۔ آج کی نئی عمارت کل پھر پرانی ہو کر ڈھے جائے گی لیکن جذبے کبھی پرانے نہ ہوں گے۔

محبت اور نفرت کی جنگ ہمیشہ جاری رہے گی۔ تم میرا یہ پیغام تو پہنچا دو گے نا اپنی بستیوں میں، کہ خوبصورت عمارتوں کے ساتھ ساتھ خوبصورت ذہن اور دل بھی تراشو ورنہ سب بے سود ہے۔ وہ دیکھو میرے ساتھی بھی دل گرفتہ ہیں شاید اُنھوں نے بھی آنے والی موت کے قدموں کی چاپ سن لی ہے۔

موت، جو بڑی بڑی مشینوں کی صورت ہماری جانب بڑھی چلی آ رہی ہے۔ کیا کہا تم نے؟ پہلے کیوں نہ بتایا؟ تم بھی انھی میں سے ایک ہو؟ تو تم بھی ان قاتل مشینوں کے خالق نکلے! مَیں نے تمھارے ہاتھوں سے دُھوکا کھایا جو میرے خالقوں جیسے لگ رہے تھے۔ اُنھوں نے زندگی دی تم چھیننے آ گئے ہو۔ شاید یہ فرق ہاتھوں کا نہیں جذبوں اور رُوحوں کا ہے۔ اب انسانی بستیوں کا اصول میری سمجھ میں آ چکا ہے۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی ہے بہت دیر۔۔۔

☆☆☆

سیلف پورٹریٹ

۱۹۸۲

اس بکھرے بکھرے سے شخص نے نظریں اُٹھائیں اور آسمان کی جانب دیکھا۔ شاید ان ڈولتے آوارہ بادلوں کے دامن میں کوئی بوند اس کے نام کی بھی ہو، لیکن نہیں۔۔۔ اس کی قسمت میں تو ازل سے ابد تک۔۔۔ بھوک لکھی ہے۔ بھوک! جس کی کئی شکلیں ہیں۔ ایک بھوک نمود نمائش کی۔ دوسری محبت کی اور ایک بھوک ہوس و طمع کی بھی تو ہوتی ہے۔ یہ قسم شاید سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ بھوک ان لوگوں کو لگتی ہے، جن کی دوسری بھوکیں مٹ چکی ہوتی ہے۔ اس بھوک کی تو کوئی حد نہیں۔ کوئی انتہا نہیں۔ ''اور میری بھوک؟'' اس نے اپنے ملگجے کپڑوں اور سوکھے پیٹ پر ایک نظر ڈالی۔ ایک طنز آمیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر رینگ گئی ''تیرے لیے تو یہی بھوک کافی ہے۔'' اس نے تلخی سے سوچا۔ کچھ دیر ہاتھ میں پکڑے برش سے کھیلتا رہا۔ پھر اپنے کمرے پر نظر دوڑائی۔ جسے کمرہ تو نہیں البتہ ''کھولی'' ضرور کہہ سکتے تھے۔۔ بوسیدہ سی چارپائی پر میلی سی چادر۔۔۔ جس کا ایک کونہ بے ترتیبی کے ساتھ فرش پر لوٹ رہا تھا۔ تکیہ جو بیچ میں سے روئی ٹوٹ جانے کے باعث مصوّر کے پیٹ کی مانند چپک رہا تھا۔ چند ٹوٹے پرانے برتن اور کچھ ادھوری تصویریں۔

مصوّر اپنی تصاویر کی قیمت سے واقف تھا۔ ان تخلیقات میں گھلے خون پسینے کے انمول ہونے کا اسے یقین تھا۔ لیکن وہ ایک آرٹ گیلری کہاں سے لائے، جہاں نمائش کیے بغیر فن کے ''سرپرست'' کسی تصویر کو گھاس نہیں ڈالتے۔

اس نے لانبی لانبی استخوانی انگلیوں کو بغور دیکھا۔ کسی نے بچپن میں جنھیں دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ وہ ایک نامور مصوّر بنے گا۔ یہ بات اس کے ذہن سے ایسی چپکی کہ کبھی نہ نکل سکی۔ ٹیڑھی میڑھی لکیریں وقت کے ساتھ ساتھ خوبصورت فن پاروں کا رُوپ دھارتی گئیں۔

اخبارات اور رسائل کے تبصروں نے اسے بھی سہانے خواب دکھانے شروع کر دیے۔ لیکن جب وہ ایک مصوّر کی حیثیت سے عملی زندگی میں داخل ہوا تو پتہ چلا کہ محض فن ہی نہیں سب کچھ۔ جیب کا بھاری ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

حقیقتیں اپنی تمامتر بدصورتوں سمیت۔ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔۔ کئی کئی دن فٹ پاتھوں پر اپنی تصویریں سجائے ہوئے وہ بھی کسی قدردان کی لمبی سی کار کا منتظر رہا۔

اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اس کی جیب میں آخری دس کا نوٹ تھا اور وہ بھی اپنی تخلیقات فٹ پاتھ پر سجائے بیٹھا تھا۔ سوائے چند اوباش اور منچلے راہ گیروں کے کسی نے اچٹتی سی نظر بھی ڈالنی گوارا نہ کی۔ شام گئے ایک کار۔ اس کے قریب آن رُکی تو مصوّر کے چہرے پر پینٹنگز کے تمام خوبصورت رنگ سج گئے۔ کار سے اُترنے والے نے پہلے تنقیدی نظروں سے مصوّر کے چہرے کو ٹٹولا۔ اس کے حلیئے کو پرکھا اور پھر لمبی سی ''ہوں'' کی۔۔۔ تصاویر پر طائرانہ نظر ڈال کر بولا۔ ''اچھی ہیں۔ کتنے میں بیچو گے یہ تمام؟

مصوّر کے ذہن میں کیمروں کے فلیش چمکنے لگے۔ جلی سرخیوں کے ساتھ کھٹا کھٹ اخبارات میں نام چھپنے لگے۔ تالیاں، داد و تحسین۔ ایک ہی لمحے نے اسے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔

''ان تخلیقات کی قدردانی آپ جیسے لوگ ہی کر سکتے ہیں۔۔'' خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے وہ بولا۔

گھاگ نظریں اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے نکل آئیں۔۔ ''دو ہزار کافی ہوں گے۔''

مصوّر کے ذہن میں بنے محل دھڑام سے نیچے آن گرے۔ خاصی کمی بیشی پر بھی وہ اپنی تصاویر بقول اس کے پھینکنے پر رضامند نہ ہوا۔

''پچھتاؤ گے۔۔ فٹ پاتھوں پر لگی تصاویر اپنی قیمت صرف بارش اور آندھی ہی سے وصول

کرسکتی ہے۔۔" طنز کے تیر چھوڑتا وہ شخص واپس چلا گیا اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ لوگوں کی ناقدری نے اس کے دل کو خون کے آنسو رُلایا۔ آخر پیٹ کی آگ نے اسے فن پارے سستے داموں بیچنے پر مجبور کر دیا۔ اچھے دنوں کی آس میں۔ اپنے دھتکارے وجود اور تصاویر کو اُٹھائے وہ نگر نگر گھومتا رہا، لیکن فن کے قدردان اس کا پیٹ نہ بھر سکے۔ خالی خالی الفاظ تو ہواؤں میں ہی تحلیل ہو جاتے ہیں نا۔

کسی ہمدرد نے مشورہ دیا "Nude بناؤ۔ ہاتھوں ہاتھ بکیں گی پیارے"۔

"نہیں مَیں فطرت کے معصوم حسن کی عکاسی کرتا ہوں۔۔" عورت بھی تو فطرت کا حسین شاہکار ہے۔" ہمدرد نے آنکھ میچی "نہیں۔۔ مَیں حسن کے نام پر عریانی کو فروغ نہیں دے سکتا۔۔" وہ اٹل تھا "تو پھر بھوکے مرو گے۔۔"

"مجھے منظور ہے۔۔" یہ کہہ کر ہمدردوں کی محفل سے اُٹھ آیا اور اب۔۔۔ وہ واقعی بھوکا مر رہا تھا۔۔۔ بیماری اسے گھن کی طرح چاٹ رہی تھی۔۔ اونے پونے اپنے فن پاروں کو دُکھتے دل کے ساتھ بیچ کر وہ گزارا کر رہا تھا۔ سوچوں کے بھنور سے اُبھر کر مصوّر نے باہر نظر ڈالی۔ سڑک پر انسانوں کا ہجوم بہہ رہا تھا۔ سبھی ایک دوسرے کو پیس کر آگے بڑھ جانا چاہ رہے تھے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنے اندر کی گھٹن کو کھڑکی سے باہر اُچھال دیا۔۔۔ لیکن سینے کا بوجھ جوں کا توں رہا۔۔ وہ مڑا تو خالی کینوس اس کی صورت تک رہا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی اور وہ تین دن سے اس کھولی میں بند بیٹھا تھا۔

گزشتہ دنوں اخبار میں تصاویر کے ایک انعامی مقابلے کا اعلان ہوا تھا۔ پہلا انعام دس ہزار تھا۔۔ "بھوک" کے موضوع پر وہ کوئی شاہکار تخلیق کرنا چاہتا تھا۔ شاید کہ قسمت ساتھ دے جائے۔۔۔ لیکن تصویر تھی کہ شروع ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔۔۔ خیالات منجمد ہو رہے تھے۔ جانے کیوں اتنا جمود طاری تھا؟

آج شام تک آرٹ گیلری والوں نے اس کی تصویر لینے آنا تھا۔۔ دن گزر رہا تھا۔۔ اپنی بے بسی پر اس کا دماغ چٹخنے لگا تھا۔ پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے تھے۔۔ نچلے کھوکھے والے نے مزید ادھار کھانا بھی بند کر دیا تھا۔ باسی گرم پانی کے گھونٹ حلق سے اُتارتے اُتارتے اس کی ہمت

جواب دے چکی تھی۔

اچانک بجلی کی سی تیزی سے ایک خیال کوندا۔ سکون کی لہر اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ اس نے کمرے میں پڑا پرانا قد آدم آئینہ اُٹھایا اور کینوس کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ اپنی قمیض اُتاری اور تنقیدی نظروں سے ہر زاویے سے اپنا جائزہ لیا۔ بڑھی ہوئی شیو، بے ترتیب بال۔۔ بوسیدہ سی جینز اور چپکا ہوا پیٹ۔ (Perfect) اپنے دُھندلے سے عکس کو دیکھ کر وہ بڑبڑایا "ایک، دو، تین۔" بے خیالی میں اس نے اپنی پسلیاں گننی شروع کر دیں اور اپنی اس حرکت پر خود ہی ہنس دیا۔ بھوک کا مکمل جیتا جاگتا نمونہ۔

وہ سٹول پر بیٹھ گیا اور برش تیزی سے چلنے لگا۔ (Self Portrait) تقریباً مکمل ہو چکی تھی کہ اچانک اس کے پیٹ میں شدید درد اُٹھا۔ یوں لگا جیسے کسی نے گرم چاقو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیر دیا ہو۔ وہ گھبرا کر اُٹھا تو لڑکھڑا گیا۔ "پانی" وہ چلایا۔ مگر آواز حلق میں اٹک گئی۔ برش چھوٹ کر دور جا گرا۔ آئینے کا عکس اسے حیرت سے تکنے لگا۔ کینوس آباد ہو چکا تھا۔ لیکن مصوّر کی نگاہوں کا اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا۔

چند دن بعد کے اخبارات میں اس کا نام اور ایک پرانی تصویر۔ جلی حروف کے ساتھ چھپی۔ اس کی تصویر کو پہلا انعام ملا تھا۔ اس خبر کے ساتھ ہی سیاہ حاشیے میں ایک اور چھوٹی سی اطلاع تھی۔

"ہمیں افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ پہلا انعام حاصل کرنے والے فنکار کی کل ناگہانی موت واقع ہو گئی۔ مرحوم ایک بلند پایہ اور سچے فنکار تھے۔ ان کے کام کو مدتوں فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ ان کی تصاویر کی خصوصی نمائش چند آرٹ گیلری میں۔۔۔"

اور "بھوک" کے عنوان سے بننے والی Self Portrait اپنی خالی خالی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

برسی

ہوا کے دوش پر لہراتی۔ میرے کانوں سے مانوس سے آرکسٹرا کی دُھن ٹکرا رہی ہے۔ مَیں نے چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ خالی نگاہوں سے اُونچی اُونچی دیواریں تکتے تکتے تھک سی گئی ہوں۔ مانوس لہجے کی خوشبو نے میرے اردگرد ایک غیر مرئی سا جال بن دیا ہے۔ مَیں نے گھبرا کر پھر آنکھیں کھول دی ہیں۔ لیکن یہ مانوس خوشبو میرا پیچھا نہیں چھوڑتی تم میرے قریب ہو میرے بالوں پر تمھاری اُنگلیاں سرسرا رہی ہیں۔ ''تم مجھے چھوڑ تو نہ جاؤ گی زندگی؟'' پُراسرار سرگوشی میرے کانوں سے بار بار ٹکراتی ہے۔ خصوصاً ان راتوں میں جب بھی کبھی مَیں چاہتی ہوں کہ تمھیں قطعاً بھول جاؤں۔ مَیں اپنی کوشش میں جیسے کامیاب ہونے لگتی ہوں۔ اپنی فتح پر قہقہے لگاتی ہوں تو نہ جانے کہاں سے وہی پُراسرار سرگوشی، میرے چاروں اطراف سرسرانے لگتی ہے۔ کسی ان دیکھے سانپ کی طرح رینگتی چلی جاتی ہے اور میرا وجود دھیرے دھیرے بل کھاتے سرسراتے سانپوں سے بھر جاتا ہے۔ تمھارے وجود کی خوشبو میرے سانس بوجھل کر دیتی ہے۔ بے اختیار ایسے سمے فنا ہو جانے کو جی چاہتا ہے لیکن میرے اور تمھارے بس میں تو یہ بھی نہیں۔

مَیں نے ہتھیلیوں کو میز پر سجا دیا ہے اور لکیروں کے ساتھ ساتھ میری نظریں دوڑ رہی ہیں۔ شاید تمھارے نام کی لکیر؟ لیکن اس لکیر کو تو مَیں نے اب کھرچ ڈالا ہے۔ تمھاری خواہش کے عین مطابق تم یہی چاہتے تھے نا۔ یہ اور بات ہے کہ تم میں یہ کہنے کی ہمت نہ تھی۔ تمھاری مشکل کو مَیں نے ہی آسان کیا تھا اور مَیں آج پھر اسی میز پر بیٹھی ہوں جہاں بیٹھ کر ہم نے زندگی کے کئی اہم فیصلے لمحوں ہی لمحوں میں کر لیے تھے۔ وہ بوڑھا بیرا مجھے عرصے بعد اور تنہا دیکھ کر حیران ہے۔

مَیں نے ہلکے سے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا ہے اس نے تعظیماً دور ہی سے سر کو ہلکا سا خم دے کر پہچان کا اشارہ دیا ہے۔ تمھارے حوالے سے مجھے پہچاننے والا کوئی تو ہے اس دُنیا میں نہ جانے کیوں میرے وجود میں رینگتے سانپ ہانپنے لگے ہیں۔ میری اوّلیں اور آخری تمنّا کی تکمیل کے بوجھ سے۔

ہوسکتا ہے کہ یہ کہانی یونہی ادھوری رہتی اور کوئی جان بھی نہ پاتا کہ مَیں کس طرح بکھری، سمٹی اور پھر بکھرتی چلی گئی۔ یہ بے ضرر سا بیرا۔ بہت بڑا نفسیات دان ہے۔ جب ہم تم پہلی دفعہ یہاں آئے تھے تو مَیں بہت نروس تھی۔ بوڑھے بیرے کی نگاہیں ہمیں جانچ رہی تھیں۔ ہماری دھیمی سرگوشیاں میرا تابناک گلابی چہرہ تمھارا والہانہ انداز سب ایک خواب سا لگ رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بوڑھی نگاہوں میں ہمارے لیے پہلے اشتیاق پھر محبت اور پھر شفقت کی قندیلیں جلنے لگیں۔ دُعاؤں اور تمنّاؤں کی اَن گنت پرچھائیوں کے ساتھ آج مجھے کئی سالوں بعد تنہا اس میز پر بیٹھے دیکھ کر بوڑھی قندیلیں مزید ماند پڑ گئی ہیں۔ چہرے پر پڑی سلوٹوں اور بالوں پر جمی اکا دکا پھپھوندی نے شاید میرے گزرے ماہ و سال کا قصہ بتا دیا ہے۔ میری خالی بانہیں بے رونق چہرہ اور کھوئی نظریں اسے سب کچھ سمجھا رہی ہیں۔ اس میز کے رومال کا رنگ بدل گیا ہے لیکن ان چار کرسیوں والی میز کا انداز ابھی تک وہی ہے۔ دو کرسیاں تو پہلے بھی خالی ہی رہا کرتی تھیں اب مَیں بقیہ تین پر نظریں جمائے بیٹھی ہوں۔ کون سی کرسی پہلے آباد ہو گی؟ کیا کیا سوچا تھا لیکن کیا خبر تھی کہ ایک دن تینوں کرسیاں میری تنہائی کا منہ چڑائیں گی۔

''مِس''؟ مَیں خیالات سے باہر آ گئی ہوں بوڑھا بیرا میرے قریب کھڑا ہے۔

''تم نے مجھے پہچانا؟'' مَیں سرگوشی میں پوچھتی ہوں۔

''یس مس!'' وہ اتنا کہہ کر رُک گیا ہے۔ مَیں جانتی ہوں وہ آگے کیا کہنا چاہتا ہے۔

''اوہو۔۔۔'' مَیں کھوکھلی سی ہنسی کے ساتھ اسے Orange juice کا آرڈر دیتی ہوں تمھارا پسندیدہ جُوس تب مَیں تمھارے چڑانے کو کوئی اور مشروب منگواتی تھی۔۔۔ نہ جانے آج کیوں جی چاہ رہا ہے کہ ہر وہ بات کروں، جس کی تم توقع کرتے تھے۔ میرے کپڑوں کا رنگ

بھی آج سفید ہے کورے کاغذ کی طرح!

آرکسٹرا کی دُھن شاید وہی ہے اتنے سال گزر گئے لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایسی دُھن ہی بجا کرتی تھی اور تم میز کے نیچے سے ہولے ہولے میرے پاؤں پر تھاپ دیا کرتے تھے۔

تم نے کئی مرتبہ پوچھا تھا ''تم مجھے چھوڑ تو نہ جاؤ گی زندگی؟'' آج سوچتی ہوں کہ تم مجھ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے خوفزدہ تھے۔ تم نے ہی تو تعلق توڑنے میں پہل کی اگرچہ برائے نام ہی سہی کچی سی ڈور تو تم نے چاہا کہ بندھی رہے۔ لیکن مَیں نے اسے ایک ہی جھٹکے سے توڑ دیا کچی ڈور کا کیا کانٹوں میں اُلجھ جائے یا کسی اور کے پاؤں تلے آ کر ٹوٹ جائے۔

بہتر تھا نا کہ مَیں خود اسے اپنے ہاتھوں توڑ دیتی۔ تمھاری تمنّا کے مطابق۔ مَیں تمھاری جان کا روگ تھی نا! مَیں نے جب کہا تھا اس روگ سے پیچھا چھڑا لو تو تم نے کہا تھا ''اسی روگ میں لذّت ہے چسکا ہے'' کتنے بے حس تھے تم صرف اس احساس کو جوان رکھنے کی خاطر کہ مَیں تمھاری ہوں تم میرے نہ ہو کر بھی مجھے باندھے رکھنا چاہتے تھے۔۔۔ خود غرض تھے نا!

خیر یہ تو ویسے ہی بات چلی ہے۔۔۔ مجھے اعتراف ہے کہ تمھاری تمام تر کمزوریوں کے باوجود، مَیں نے تمھیں چاہا اور اتنا ٹوٹ کر چاہا کہ آج تک اپنے بکھرے ریزوں کو ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔

اوہ یہ کیا ہوا؟ میرے وجود میں تیرتے برف سے ناگ۔۔۔ پھر سر اُٹھانے لگے ہیں۔۔۔ اتنی یخ بستگی ہے کہ دل شعلوں کا تمنائی ہے ٹھنڈک تو احساسات کو سلا دیتی ہے۔۔۔ یخ بستہ جذبوں کے ساتھ کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔۔۔ اسے موت آ جاتی ہے۔۔۔ بظاہر وہ چلتا پھرتا ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ اپنے اور دوسروں کے وجود سے منکر ہونے لگتا ہے۔۔۔ زندہ لاش کی طرح جینا کتنا مشکل بلکہ کتنا خوفناک سا تصور ہے۔۔۔ ہے نا؟

اوہو۔۔۔ مَیں کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔۔۔ اورنج جُوس گرم ہو چکا ہے۔۔۔ آج میرے شوہر کی برسی ہے۔۔۔ مَیں اپنے بیٹے کو لینے سکول جا رہی تھی تاکہ اسے ساتھ لے جا کر اپنے جیون ساتھی کی قبر پر کچھ پھول اور کچھ آنسو نچھاور کر سکوں مجھے نہیں علم کہ میرے قدم کیسے اور کیوں کر اس ریستوران کی جانب اُٹھ گئے؟ شاید محبت کی برسی منانے کو!

کھوٹا سکہ

۱۹۸۲

ابھی فلائیٹ روانہ ہونے میں تین گھنٹے باقی تھے۔ ہراساں اور پریشان حال بہاری، ایئر پورٹ کے لاؤنج میں بھیڑ بکریوں کی مانند ایک دوسرے سے چمٹے بیٹھے تھے۔ ہر کھٹکے پر نگاہیں اُٹھتیں۔ سانسوں کا زیر و بم متلاطم ہو جاتا کسی کونے میں سرگوشی کی آواز ذرا تیز ہو جاتی مائیں بچوں کو سینوں سے لپٹانے لگتیں۔ سہاگنوں کے ہاتھوں کا دباؤ اپنے ساتھی کے ہاتھوں پر سخت ہو جاتا کہ آنے والے لمحوں کا کسی کو اعتبار نہ تھا۔

ہر ہر سانس صدیوں کا سفر طے کر کے پہنچ رہا تھا اور گھڑی کی رفتار جیسے رُک سی گئی تھی۔ پیالوں میں پڑی چائے، پرانی محبتوں کی مانند سرد پڑ چکی تھی۔

شفیق کونے میں کھڑا، سارے چہروں کو بغور پڑھ رہا تھا، ایسی بے چینی ایسا اضطراب، اسے سکون دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھلنگا سی چارپائی پر سو پڑنے والے کا سا اطمینان لہریں مار رہا تھا۔ وہی سکون، جو کئی مہینوں سے سنہری ریشوں کی سرزمین پر کٹے پھٹے جسم دیکھ کر، گاڑھا خون بہا کر، اذّیت و کرب کی تصویریں اور دہشت سے پھٹی آنکھیں دیکھ کر وہ حاصل کر رہا تھا۔

انسانی آنکھ ان نظاروں کی عادی ہو گئی تھی۔ ''ایک پاکستان'' کا نعرہ لگانے والوں کا خون بہانا تو مکتی باہنی کا پسندیدہ شغل تھا۔ شفیق بھی اسی تنظیم کا ایک کارندہ تھا۔ اس نے بھی گھروں کو لوٹا، ''جلا دو مٹا دو'' کے نعرے لگائے اور انسانی جسموں کو سنگینوں میں پرو دیا۔

شروع شروع میں تو وہ غیر بنگالیوں کے خون کو دیکھ کر چیخ پڑتا۔ ''ہمارے سنہرے ریشے کی

قیمت ادا کرواب'' مگر اچانک ہی کہیں سے باپ کا ہیولیٰ آن موجود ہوتا۔ اس کی نورانی صورت نگاہوں کے سامنے آجاتی دُبلا پتلا منحنی سا وجود، غصّے کی آگ میں پھنک رہا ہوتا جیسے۔۔۔ ''کیا مَیں نے یہی سکھایا تھا تجھے۔ کیا ہم گھر بار لٹا کر ایک پرچم تلے اسی لیے جمع ہوئے تھے کہ اپنے ہی ہاتھوں اس کی دھجیاں بکھیر دیں'' پھر یوں لگتا جیسے اس کا سانولا سا جھرّیوں بھرا چہرہ، آنسوؤں میں ڈوب رہا ہو۔

شفیق باپ کے ہیولے کو کوستا اور مزید شدومد کے ساتھ لوٹ مار میں شریک ہو جاتا۔ مکتی باہنی کے حواری، خوش ہو کر اس کی پیٹھ ٹھونکتے، رفتہ رفتہ ہندو کا گھولا ہوا زہر رگوں میں چڑھتا گیا اور باپ کا ہیولیٰ دور کہیں نفرتوں کے سیلاب میں بہہ گیا۔

غیر بنگالیوں کا عالمی امن کمیٹی کے توسط سے انخلا شفیق اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک چیلنج بن گیا تھا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ پلک جھپکتے میں ان زندہ جسموں کو لاشوں کے ڈھیر میں بدل دیں، مگر اُنھیں ذرا انتظار کرنا تھا۔

شفیق بے چینی سے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا کہ کینٹین کے بیرے نے آکر پیغام دیا ''سر آپ کا فون ہے''۔ وہ جلدی سے بوتھ میں گھس گیا دوسری جانب کیلاش تھا۔ ''بتاؤ کیا ہوا کام کا؟'' شفیق نے بے تابی کے ساتھ پوچھا۔

ہاں۔ صبر تو کرو۔۔۔ کیلاش نے مکروہ سی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔۔۔ پھر مختصر سی گفتگو کے بعد سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شفیق کا چہرہ سوچ میں ڈوب گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بوتھ سے نکل کر لاؤنج کی جانب بڑھا۔ اُمید اور نا اُمیدی کے درمیان ڈوبتے اُبھرتے ان ذی رُوحوں کے لیے اس کے دل میں کوئی جذبہ ترحم نہ تھا۔ اس نے شانے اچکے اور تیز نظروں سے ہال کا جائزہ لیا۔ دور کونے میں ایک جواں سال خاتون اپنی بچی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ چہرے پر پھیلا ماتم ظاہر کر رہا تھا کہ اس کا ساتھی دور کہیں بہت دور کھو چکا ہے۔ چار پانچ سالہ بچی بڑے تجسّس کے ساتھ ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہی تھی۔ شفیق کی نظر فوراً اپنی مطلوبہ شے پر پڑی۔ صوفوں کے درمیان سے وہ منافقانہ مسکراہٹ لبوں پر سجائے گزرتا گیا۔

''ہیلو بے بی'' اس نے بچی کے پاس پہنچ کر چمکارا۔ جواب میں بچی کی ماں نے اپنی مشکوک نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ''معاف کیجیے گا مسز وقار'' وہ بے حد اعتماد کے ساتھ گویا ہوا۔ ''مَیں آپ کے شوہر سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اکثر مغربی پاکستان آتے جاتے مجھ سے ملتے رہتے تھے۔۔۔ آج آپ کو ان کے بغیر دیکھ کر مجھے بے حد رنج ہو رہا ہے۔۔۔'' میرا آپ سے تعارف نہیں۔ بمشکل تمام اس کے سوکھے لبوں سے نکلا۔ جواباً شفیق نے اپنا ہاتھ بچی کی جانب بڑھایا۔۔۔ ''بیٹے مَیں آپ کے ابو کا دوست ہوں۔'' اس کے پُر اعتماد انداز لہجے نے مسز وقار کو شش و پنج میں ڈال دیا۔ بچی پھدک کر اس کے ساتھ آن لگی ''انکل تب تو آپ کو ابو کا ضرور پتہ ہو گا۔ وہ کب آئیں گے۔ ممّا روز مجھ سے جھوٹ بول دیتی ہیں کہ وہ کل آئیں گے مگر وہ آتے ہی نہیں'' بچی کی معصوم آنکھوں میں اُمید کے دیے جل رہے تھے۔

مسز وقار کی پلکیں بھیگ گئیں۔ شفیق کو بے نام سی خلش محسوس ہونے لگی۔

''بیٹے آپ کے ابو ضروری کام سے گئے ہیں۔ جلد آجائیں گے'' یہ کہتے ہوئے اس نے گڑیا بچی کے ہاتھ سے لے لی۔ '' آہا کتنی پیاری ہے آپ کی گڑیا!'' بچی اس تعریف سے کھل اٹھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور تعارف کے بعد جب شفیق کو احساس ہوا کہ اس نے دونوں کا اعتماد حاصل کر لیا ہے تو وہ بچی کو کھلونے دکھانے قریبی Duty free Shop پر لے گیا۔ مسز وقار کی نگران نگاہوں کا شفیق کو پورا پورا احساس تھا۔ پاس کھڑے ایک شخص نے چند لمحوں کے لیے گڑیا اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھی اور واپس بچی کو تھما دی۔

''انکل میری ممّا ہر وقت کیوں روتی ہیں۔۔۔ وہ کہتی ہیں جنھوں نے ہمارا گھر جلایا ہے وہ گندے آدمی ہیں۔۔۔ ہیں نا انکل؟'' ''ہوں''! شفیق چور سا بنا بولا۔

''اور آپ کو پتہ ہے انکل گندے لوگوں کو اللہ میاں اتنے بڑے تنور میں جلا دیتے ہیں۔۔'' اس نے اپنے ننھے منے بازو ہوا میں پھیلا دیے۔ معصوم ذہن سے یہ انکشاف جو لاشعور کے کسی کونے میں چھپا بیٹھا تھا ایک دم نیا نیا سا لگا۔ شفیق نے جھرجھری لی۔ حقیقت اپنی پوری سچائی [illegible] شفیق کی روح سے آن ٹکرائی۔ وہ لڑکھڑا سا گیا۔

بچی نے بے خبر اپنی رو میں بولے چلی جارہی تھی۔ ''انکل آپ تو اتنے اچھے ہیں۔ آپ کیوں گندے لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ مما کہتی ہیں ہم اچھے لوگوں کے پاس دور اپنے گھر جارہے ہیں۔ آپ بھی ساتھ چلیں نا!'' بچی کی معصوم محبت سے لبریز نگاہیں شفیق کے چہرے پر گڑی تھیں۔

''ہاں ہاں بیٹا۔۔ مَیں آپ کے گھر ضرور آؤں گا۔'' وہ بمشکل مسکرا سکا ''مَیں وہاں سب کو بتاؤں گی کہ یہ انکل میرے ابو کو لائیں گے۔ ہے نا؟ بچی نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھپتھپایا۔

معصوم بے لوث لمس میں جادوئی اثر تھا۔ وہ باتونی گڑیا اپنے الفاظ کے ردِّعمل سے بے خبر۔۔ بس بولے جارہی تھی۔۔۔ اور شفیق کا ذہن سائیں سائیں کررہا تھا۔ نہ جانے کس کونے سے باپ کا ہیولیٰ پھر نگاہوں کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

محبت کرنے والوں کی اولاد نے ملک کو دو ٹکڑے کردیا۔ تو کیا نفرتوں کا شکار ہونے والے یہ بچے، ٹکڑوں کو کرچیاں ہونے سے بچا سکیں گے؟۔۔۔ ڈھاکہ اور چٹا گانگ میں بھی کوئی دیوار نہ کھڑی ہو جائے؟۔۔۔ اس سے آگے اس کا ذہین کچھ نہ سوچ سکا۔

عین اسی لمحے وہ اناؤنسر کی آواز سے چونکا۔ ''خواتین وحضرات توجہ فرمائیں۔ کراچی جانے والا جہاز پرواز کے لیے تیار ہے۔ مسافروں سے درخواست۔۔۔۔''

یہ سنتے ہی لوگ تیزی سے باہر کی جانب لپکنے لگے۔ ان کی چہروں کی مردنی بشاشت میں بدل گئی۔ شفیق بت بنا کھڑا تھا۔ مسز وقار اُٹھی اور بچی کا ہاتھ تھامے باہر کی جانب بڑھی۔ شفیق میکانکی انداز میں ان کے ساتھ چل پڑا۔

ایپرن پر تازہ ہوا کے جھونکے نے ان کا استقبال کیا۔ بچی نے اپنے گیلے گیلے ہاتھوں سے اسے جھنجھوڑا۔۔ ''انکل آپ بھی چلیں نا ہمارے ساتھ۔ آپ مجھے یاد آئیں گے۔'' یہ کہتے کہتے اس کی نظریں دُھندلا گئیں۔ دو موٹے موٹے آنسو اس کے شفاف رخساروں پر ڈھلک آئے۔

''اچھا شفیق صاحب خدا حافظ۔۔ چلو بیٹے دیر ہورہی ہے۔'' مسز وقار نے بچی سے کہا۔ وہ رُکے رُکے قدموں کے ساتھ آگے بڑھی اور پھر پلٹ کر اس نے شفیق کو پکارا ''انکل۔۔۔۔''

نہ جانے کس جذبے کے تحت وہ بازو پھیلائے آگے بڑھا اور جھک کر اپنے ہونٹ بچی کی پاکیزہ پیشانی پر رکھ دیے۔ بچی نے اس کے چہرے پر مقدّس محبت کی مہر ثبت کردی۔

اور پھر وہ سب کچھ ہوگیا۔ جو شفیق کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ اس نے گڑیا بچی کے ہاتھ سے چھینی اور رن وے پر جہاز کی مخالف سمت میں بھاگتا چلا گیا۔

☆☆☆

ترازو

کنڈیکٹر میرے کان کے قریب معنی خیز انداز میں کہتا ہے۔ ''استاد جی روک کے۔ بڑی بم سواری ہے۔'' مَیں چونک کر سٹاپ پر نظر دوڑاتا ہوں کالج یونیفارم میں ایک پُرکشش سی لڑکی کھڑی ویگن کو رُکنے کا اشارہ دے رہی تھی۔ بریک چرچراتے ہیں اور وہ اُچک کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ جاتی ہے۔

اس کے بیٹھتے ہی تیز خوشبو کی لپٹیں میرے نتھنوں سے ٹکراتی ہیں اور مَیں کیسٹ پلیئر کا بٹن تلاش کرنے لگتا ہوں۔ یہ میری عادت بن چکی ہے جونہی فرنٹ سیٹ پر کوئی حسین زنانہ سواری بیٹھتی ہے۔ میرا ایک ہاتھ آپ ہی آپ۔ کیسٹ پلیئر پر جا پڑتا ہے۔ اگلے سٹاپ سے ایک ادھیڑ عمر مرد اور ایک میک اَپ زدہ موٹی سی عورت سوار ہوتے ہیں۔ عورت بات کم کر رہی ہے اور اپنے ساتھی مرد پر جو یقیناً اس کا میاں ہے۔ زیادہ بگڑ رہی ہے۔ اس کا سانس پھول رہا ہے مگر وہ تیز تیز بولے جا رہی ہے ''تمھیں تو کہا تھا کہ امّاں کو رضیہ کے ہاں بھیج دو۔ کچھ تو بیٹی بھی خدمت کرے نا۔۔۔ ماں کی۔'' مرد بے چارہ بیوی کی باتوں پر کم اور لوگوں کے تاثرات پر زیادہ توجہ دے رہا ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں التجائیں کر رہا ہے۔ ''چُپ ہو جاؤ۔ لوگ سن رہے ہیں۔'' وہ دھیمے لہجے میں کئی بار دہرا چکا ہے، مگر خاتون کو کسی کی پرواہ نہیں۔ مجھے بے چارے کی بے بسی پر ترس آ جاتا ہے۔ مَیں کنڈیکٹر کو آنکھ مارتا ہوں اور ایک تیز لَے کی کیسٹ اونچی آواز میں لگا دیتا ہوں۔

رفتہ رفتہ خاتون کی غراہٹ بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بیک ویو مرر میں دیکھتا ہوں۔ مرد نے سکھ کا سانس لیا ہے۔ یونہی ہوتا ہے، روزانہ ہوتا ہے۔ روز اسی روٹ پر چلتے۔ مخصوص سٹاپس پر سے مخصوص لوگوں کو ویگن میں بھر کر آگے چل پڑتا ہوں۔ کبھی کبھار جب کوئی دوسری ویگن میرے

مسافر لے جاتی ہے تو عجیب سی بے چینی مجھے گھیر لیتی ہے۔ انسان بھی کتنی گنجلک شے ہے۔ ان چہروں، ان لوگوں، مقامات کو بہلاوے بنا لیتا ہے۔ جو محض ایک روٹین ہے۔

اب F.I.A کے سٹاپ سے بیٹھنے والے اس واسکٹ اور چشمے والے بوڑھے کو بھلا کیا علم ہو گا کہ جس روز وہ کسی اور ویگن پر چلا جاتا ہے تو مجھے کس قدر الجھن ہوتی ہے۔ میرا اس سے بھلا کیا واسطہ؟ مگر اس کے، میری ویگن میں بیٹھنے سے مجھے نہ جانے کیوں تسلّی سی رہتی ہے۔ مَیں گرچہ بہت مذہبی آدمی تو نہیں مگر واسکٹ والا زیرِ لب دُعائیں دہراتا رہتا ہے تو مجھے اطمینان سا رہتا ہے۔ پھر مَیں دھیمی آواز میں گانے بجا کر خوب اوورٹیکنگ کرتا ہوں۔ اب بھلا کاہے کا ڈر!

بچپن بھی عجیب شے ہے۔ مکڑی کے جالوں کی طرح، زندگی کے غار کے دہانے پر اس طرح ٹھکانے بنا لیتا ہے کہ لاکھ کوشش کرو اس کے مہین تار کہیں نہ کہیں چپکے رہ جاتے ہیں۔ جب میرا باپ زندہ تھا تو گھر سے نکلتے وقت ہمیشہ مجھ پر دعائیں پڑھ کر پھونکتا تھا۔ ویسے تو مَیں ہنستا تھا اس کی اس عادت پر، مگر ایمان کی بات ہے کہ جس دن وہ دُعا نہ پڑھتا میرا جی ماندہ رہتا تھا۔

اور ایک وہ چھوٹی سی بچی جو اپنے سے بڑا بیگ اٹھائے اُچھل کر ویگن میں آن سوار ہوتی ہے۔ ساتھ میں اس کی ماں بھی ہوتی ہے جو اسی سکول میں استانی ہے۔ بے چاری بڑی دُکھی ور بھلے مانس لگتی ہے۔ ہمیشہ اپنے ہی خیالوں میں کھوئی رہتی ہے۔ سیدھی سی چوٹی، سادہ سے کپڑے اور ہلکی سی لپ اسٹک، ویگن میں بیٹھتے ہی وہ پرس سے کرایہ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیتی ہے اور پھر سارا وقت کھوئی کھوئی سی سامنے دیکھتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی چونک کر بیٹی کو تنبیہہ کرتی ہے ''خاموش رہو!'' اور پھر کھو جاتی ہے۔ کئی بار خاموش بیٹھی بچی حیرت سے اس تنبیہہ پر غور کرتی ہے اور پھر اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کو جھٹکتی آتی جاتی گاڑیوں میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔

مجھے اپنے مستقل مسافروں سے بے نام سی انسیت ہو گئی ہے۔ ایک بے نام سا تعلق۔ ایک بے نام سا احساس ہے۔ ایک ڈور ہے جس کا دوسرا سرا زمین پر لٹک رہا ہے یا شاید کسی کے ہاتھ میں ہے؟ کچھ پتہ نہیں؟

یا اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ڈور کا دوسرا سرا اکثر اس ہاتھ میں نہیں ہوتا جس میں آپ سمجھ رہے

ہوتے ہیں کہ وہ ہے۔! آپ ڈور کو تھامے جب دوسرے سرے تک پہنچتے ہیں تو وہ کسی اجنبی ہاتھ میں ہوتا ہے یا کہیں دور کھو چکا ہوتا ہے اور آپ خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔

مَیں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا؟ بات ہو رہی تھی اس نئی سواری کی۔ جو آج ہماری ویگن میں بیٹھی ہے۔ کنڈیکٹر مسکرا کر ''فرنٹ سیٹ'' سے کرایہ مانگ رہا ہے۔ کالج کی پُرکشش سی لڑکی بڑے انداز سے اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ اپنا بازو ہلاتی ہے اور چوڑیاں چھن سے بج اٹھتی ہیں۔ تیکھے نقوش والی یہ لڑکی اپنے جادو سے واقف ہے۔ جبھی تو بڑے طریقے سے اسے استعمال کر رہی ہے۔ بڑی انجان بن کر نمائش کر رہی ہے۔ مَیں ہوں تو ویسے کم علم آدمی مگر ایک دفعہ جو میری ویگن کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی آدھی نفسیات تو جان ہی جاتا ہوں۔ مَیں کن آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ لڑکی بار بار ویگن کی سائیڈ پر لگے شیشے میں اپنا چہرہ دیکھ رہی ہے۔ اس کا ایک پیر گانے کی دُھن کے ساتھ ہولے ہولے تھاپ بھی دے رہا ہے۔ ''شے اچھی ہے'' کنڈیکٹر سے ضبط نہیں ہوتا۔ وہ مجھ سے براہ راست مخاطب نہیں مگر مَیں سمجھ جاتا ہوں اور تائید میں سر ہلا کر مسکرا دیتا ہوں۔

کالج کے سٹاپ پر وہ اُچھل کر اُترتی ہے اور تیز تیز چلتی کالج میں داخل ہو جاتی ہے۔ ''استاد جی بڑی ظالم شے ہے'' مگر ولن بھی ابھی سے انٹر ہو گیا ہے۔'' کنڈکٹر سرگوشی کرتا ہے۔ ''کیا مطلب ہے؟'' مَیں واقعی نہیں سمجھ پایا۔ ''استاد جی جہاں سے یہ بیٹھی تھی نا! وہیں سے ایک لال رنگ کی کار بھی ویگن کا پیچھا کر رہی ہے''

''ارے چھوڑ بھی اکرم تُو تو خوامخواہ ہی جاسوس بن رہا ہے''۔ مَیں ہنس پڑتا ہوں۔

''قسم اللہ پاک کی استاد جی۔ دیکھ لینا میری بات سولہ آنے سچی ہے'' وہ بڑے یقین کے ساتھ کہتا ہے اور واقعی چند ہی دنوں میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ لال رنگ کی ایک مخصوص کار اس پُرکشش لڑکی کا پیچھا کرتی ہے کبھی آگے، کبھی پیچھے۔ وہ ویگن کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ جب تک لڑکی اپنے سٹاپ پر اُتر نہ جائے۔ اب تو لڑکی کے چہرے کی گھبراہٹ بھی نمایاں ہونے لگتی ہے۔ مرد کی نفسیات بھی کیسی ہے۔ خود تو ہر جگہ ولن بن جاتا ہے مگر جونہی کسی اور کو ولن بنتا دیکھتا ہے۔ فوراً

غیرت کھا کر ہیرو بن جاتا ہے۔ اکرم کی بھی غیرت جاگتی ہے۔ ''استاد جی کیوں نہ لال کار والے کو ایک سبق سکھایا جائے؟''

''رہنے دے ہمیں کیا'' اگرچہ دل سے مَیں بھی اکرم کی طرح ہی کرنا چاہتا ہوں۔ ''نہیں استاد جی وہ بھی تو کسی کی بہن بیٹی ہے۔'' ''بم شے'' اور ''ظالم شے'' جیسے الفاظ بولنے والا اکرم بہن بیٹی کی بات کرتا انوکھا سا لگتا ہے۔ ''تو بتا کیا کریں؟'' مَیں فوراً ہی ہتھیار ڈال دیتا ہوں۔ اس ڈر سے کہ کہیں اکرم کا جوش ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔

''کل سٹاپ پر آئے گا تو پکڑ کر ٹھکائی کر دیں گے جی''

''ہاں یہ ٹھیک ہے'' سنسنی خیز ہنگامے کا تصور مجھے تازہ دم کر دیتا ہے۔

اگلے دن سٹاپ پر سے جونہی وہ لڑکی اُچک کر ویگن میں بیٹھتی ہے، لال کار ساتھ ساتھ رینگنے لگتی ہے۔ تھوڑی دور جا کر اکرم میرا شانہ تھپتھپاتا ہے۔ مَیں ویگن روک دیتا ہوں۔ لال کار کے بریک بھی چرچراتے ہیں۔ اکرم تیزی سے اُتر کر لال کار تک پہنچتا ہے اور کار کا اگلا دروازہ کھول کر دُبلے پتلے فیشن ایبل لڑکے کو باہر نکال کر پے در پے دو تین گھونسے مارتا ہے۔ لڑکا اس افتاد سے بوکھلا جاتا ہے۔ ایک ہجوم اکٹھا ہوتا ہے۔ دو سپاہی بھاگ کر ہماری طرف بڑھتے ہیں۔

''ہٹو، ہٹو۔ ایک طرف ہٹو'' اکرم فاتحانہ انداز میں سینہ تانے کھڑا ہے۔

''کیوں کیا ہنگامہ ہے؟'' ایک سپاہی ڈپٹ کر پوچھتا ہے۔ ''یہ جی۔۔۔ یہ لفنگا روز اس لڑکی کو تنگ کرتا ہے جی۔ آج ہم نے اسے سبق سکھایا ہے۔

اکرم بڑے فخر کے ساتھ بتاتا ہے۔ میں ازلی بزدلی، جو مجھے گریجویٹ ہونے کے ناطے عطا ہوئی ہے، کے باعث چُپ رہتا ہوں۔

''بکواس کرتے ہو تم Idiot۔ لڑکا نفرت سے زمین پر تھوک دیتا ہے۔ یہ دو ٹکے کے لوگ۔ ان کی یہ جرأت؟'' I'll see them لڑکا انگریزی کا رُعب جھاڑتا ہے۔ گرد سنتریوں اور ہجوم کے چہروں پر بیٹھنے لگتی ہے۔ لوگ مشکوک انداز میں ہمیں گورنے لگتے ہیں۔

یہ جھوٹ بولتا ہے جی۔ اس لڑکی کو بلا کر پوچھ لیں۔ جسے یہ تنگ کرتا ہے'' اکرم کا لہجہ اب بھی

مضبوط ہے۔

لڑکی ویگن کی ونڈ سکرین سے، دم بخود یہ سارا منظر دیکھ رہی ہے سپاہی کے اشارے پر وہ آہستہ آہستہ ہم تینوں کے قریب آن کھڑی ہوتی ہے ''بولو بی بی۔ یہ کیا معاملہ ہے؟'' سپاہی نوٹ بک نکالتا ہے۔

لڑکی کی نگاہوں میں بچھی سوچ کی بساط پر مہرے آگے پیچھے حرکت کر رہے ہیں۔ ہجوم میں مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ اُبھر رہی ہے۔ سپاہی پھر پوچھتا ہے۔ ''بی بی۔ کیا یہ کار والا واقعی تنگ کرتا ہے؟''

لڑکی ایک ثانیے کو ہماری جانب دیکھتی ہے، پھر بڑے سکون کے ساتھ کہتی ہے۔ ''یہ تو میرا منگیتر ہے۔ یہ بھلا مجھے کیوں تنگ کرے گا۔''

یہ کہہ کر وہ ہکا بکا کھڑے لال کار والے کے برابر کھڑی ہوتی ہے۔

ہجوم کی بھنبھناہٹ، غراہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور لمبے لمبے ہاتھ ناخنوں سمیت ہماری جانب بڑھنے لگتے ہیں۔

☆☆☆

مَیں + نہیں = وہ

وہ مجھے اکثر ملتی ہے، میری اور اس کی دوستی بھی نرالی ہے۔ ہر ڈھنگ ہر ادا۔ اس رشتے کی بس اپنے ہی طور کی ہے۔ اس کی ایک عادت مجھے سخت ناپسند ہے۔ اسے مجھ سے تنہائی میں ملنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ کبھی راہ چلتے مجھ پر نظر پڑ جائے یا مَیں ہجوم میں گھری ہوئی ہوں تو وہ نظر بچا کر اجنبیوں کی طرح گزر جاتی ہے۔ بعد میں مَیں اس پر بگڑتی ہوں تو بڑی معصومیت سے کہتی ہے۔

''دوسروں کے درمیان میری Value کم ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور تم جانو کہ مَیں ٹھہری سدا کی ''مَیں پرست''۔

اور مَیں لاجواب ہو جاتی ہوں۔ اس کا میرا ساتھ بہت پرانا ہے۔ پہلی بار وہ مجھے سڑک کنارے کھڑی ملی تھی۔ فراک پائجامے میں ملبوس۔ بالوں کی دو پونی ٹیل بنائے۔ مَیں ایک اندھے بوڑھے کو سڑک پار کروا رہی تھی تبھی اس کا مجھ سے ٹکراؤ ہو گیا۔ وہ دن اور آج کا دن اب تک ہماری دوستی قائم ہے۔

ہاں کبھی کبھار ان بن ہو جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔ بے حد معمولی سے جھگڑے دونوں کو غصہ دلا دیتے ہیں مگر وہ تو شاید کسی اور ہی دُنیا کی مخلوق ہے۔ اس کی سوچیں اس قدر مختلف اور منفرد ہیں کہ مَیں بسا اوقات سر پیٹ لیتی ہوں لیکن اس پر ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا۔ ہماری دوستی کی بنیاد کئی مشترک اور متضاد قدریں ہیں۔ میری طرح وہ بھی پارہ صفت مہم جو ہے۔ اسے کسی پل قرار نہیں۔ پھولوں اور پانیوں کی دیوانی میری ہی طرح برف سے جمی چوٹیاں دیکھ کر تالیاں بجانے لگتی ہے لیکن اس کی سمندر کی طرح پُرسکون فطرت اور نڈر پن مجھے Complex میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

مَیں اس کے مقابلے میں بے حد کمزور ہوں۔ اپنے حالات سے۔ اپنے آپ سے ڈر جاتی ہوں۔ ریشم کے کویا کی طرح اپنے خول میں اندر ہی اندر سکڑتی رہتی ہوں۔ کسی پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیتی اور یہ بھی چاہتی ہوں کہ لوگ میری اس کمزوری کو جان نہ پائیں۔ مجھے کمزور نہ سمجھیں۔ میری اس حرکت سے اسے سخت چڑ ہے۔

''تم منافق ہو''۔ وہ اپنی چمکیلی نظریں مجھ پر گاڑ دیتی ہے۔

''مَیں منافق نہیں۔ لیکن مجھے یہ رُوپ دھارنے پڑتے ہیں۔ کیوں کہ میری اس زندگی میں میرے اور بھی کئی شریک ہیں۔'' مَیں نظریں چرا لیتی ہوں۔ نجانے کیوں؟

''تو پھر کڑھتی کیوں ہو۔ تمھاری مسکراہٹ اور قہقہے، تمھارے اندر سے اُٹھنے والی چیخوں کو کیوں دباتے رہتے ہیں۔؟ ایسے لمحے وہ جذباتی ہو جاتی ہے۔ تیز تیز ہاتھ چلاتی ہوئی، مجھ پر بگڑتی ہوئی۔ مجھے اس پر بے اختیار پیار آ جاتا ہے۔ لیکن دونوں جانتی ہیں کہ ہم ایک دوسرے کا بدل کبھی نہیں بن سکتیں۔ اس کی باتوں کے جواب میں بے بسی کے آنسو میرا چہرہ بھگو دیتے ہیں تو اس کا لہجہ نرم پڑ جاتا ہے۔

''سنو اگر تم معاشرے سے بغاوت نہیں کر سکتیں۔ اگر خود کو نفرتوں اور محبتوں کے جال میں جکڑے رکھنا چاہتی ہو تو میرے سامنے رویا مت کرو''۔

''تم بھی یہی کہتی ہو'' میرا لہجہ یاس آمیز ہوتا ہے ''تم سے کہہ سن کر تو مَیں ہلکی پھلکی سی ہو جاتی ہوں ورنہ شاید۔'' مَیں بے دردی سے اپنی پلکوں کو رگڑ ڈالتی ہوں۔ اس کی بے چین نظریں، میرے چہرے کو پڑھ رہی ہوتی ہیں۔ ''ورنہ شاید۔۔۔ مَیں ان خود ساختہ بے رحم اصولوں سے ٹکرا جاؤں گی۔ اس طرح کہ میرے ریزے، میری کرچیاں سب کو اندھا کر دیں گی یا پھر۔'' مَیں چُپ کر جاتی ہوں تو وہ تیزی سے پوچھتی ہے۔

''یا کیا''

اپنے خول میں گھٹ کر ختم ہو جاؤں گی۔'' مَیں زبردستی مسکراتی ہوں تو وہ چلا اُٹھتی ہے۔

''میرے سامنے تو کم از کم اس طرح مت مسکرایا کرو۔ نفرت ہے مجھے تمھارے اس دوغلے

پن سے۔''

وہ ہمیشہ یونہی مجھ سے جھگڑتی ہے۔ روٹھ کر چلی جاتی ہے، لیکن پھر خود ہی مان بھی جاتی ہے۔ بہت حساس ہے نا۔ اسی لیے تو کبھی کبھی دوسروں کی خاطر مجھے ڈانٹنے بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن ہم ایک دوسرے کی کمزوری ہیں اور ضرورت بھی اور جب کمزوری اور ضرورت مل جائیں تو انسان دو کوڑی کا بھی نہیں رہ جاتا۔

اس کی ہر ادا انوکھی ہے۔ اسے رات گئے چپکے سے میرے کمرے میں آنا اور پھر میرے بستر میں گھس جانا اچھا لگتا ہے۔ مَیں آ گئی ہوں۔ وہ دھیمے سے سرگوشی کرتی ہے اور مَیں اس کے مہربان وجود کی گرمی محسوس کرنے لگتی ہوں۔ اس کی موجودگی مجھے مکمل سا کر دیتی ہے۔ اپنا آپ بھرپور سا لگنے لگتا ہے۔ وہ خلا جو ہر لمحہ میرے اندر موجود رہتا ہے اس کی گرفت ڈھیلی سی پڑ جاتی ہے۔ ایسے سمے مجھے کسی بھی قسم کی مداخلت زہر لگتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بس یہیں زندگی کے تار ٹوٹ جائیں۔ اس کے دوبارہ آنے تک، کون جانے کتنے پتھر میری طرف آئیں گے؟۔ کیا پتہ کون سا پتھر آخری پتھر ہو؟ میری خواہش ہے کہ مَیں اسی کی آغوش میں مروں وہ جو میری ہے۔ فقط میری۔

اس کی نصیحتوں سے مجھے کبھی کبھی چڑ بھی ہونے لگتی ہے۔ کسی فلاسفر جیسی لگتی ہے۔ جب وہ اپنی ذہین آنکھوں میں سوچ کے دائرے لیے۔ سلجھے سلجھے انداز میں مجھے زندگی کے اسرار سمجھاتی ہے۔ تو مَیں منہ پھاڑے حیرت سے اسے تکتی رہ جاتی ہوں۔ اس نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔ کبھی بھی ٹھوکر لگی۔ اسی نے حوصلہ دیا۔ تپتی دُھوپوں میں سایہ بنی۔ اسی لیے تو اس کی کڑوی کسیلی بھی سن لیتی ہوں۔

کئی باتیں اس کی، مجھے اپنی ہی نگاہوں میں بے حد چھوٹا سا کر دیتی ہیں لیکن وہ جان جاتی ہے اور اس طریقے سے Handle کر کے مجھے تھپکیاں دے کر اخلاق کے منبر پر بیٹھا دیتی ہے کہ مَیں اس کی چالاکی کی قائل ہو جاتی ہوں۔ وہ نہ جانے کن دُنیاؤں اور کن زمانوں کی باتوں سے مجھے مسحور کر دیتی ہے۔ ''مجھے بھی اس دُنیا میں لے جاؤ نا۔'' مَیں بھکاریوں کی طرح گڑگڑاتی ہوں تو وہ کھلکھلا اُٹھتی ہے۔

''یہ دُنیا تو میری ہے۔ میرے ذہن میں آباد ہے۔ یہاں تک تمھاری رسائی مشکل بلکہ نا ممکن ہے۔''

مَیں مچل جاتی ہوں ایسی دُنیا کے لیے جہاں امن اور آتشی ہے۔ جہاں محبت ہے، جہاں معصومیت اور خلوص۔ زر و ہوس کے ترازو میں نہیں تلتی، مَیں ضد کروں تو یہ کہہ کر اُٹھ جاتی ہے

''اپنے دل میں جھانک لو۔ اگر وہاں یہ دُنیا نظر نہ آئے تو دیواروں سے سر ٹکرا کر مر جانا بہتر ہے۔ تمھارے لیے مَیں اس معمّے کو حل کرنے سے قاصر رہتی ہوں اور وہ الفاظ کے بھنور میں مجھے اکیلا چھوڑ کر۔ احساس کی کشتیاں کھیتی ہوئی دور میرے ذہن کے ساحلوں سے دور نکل جاتی ہے۔ مَیں فقط ریت اور ساحل کے کھیل میں اُلجھ کر رہ جاتی ہوں۔ یہاں تک کہ وہ پھر کسی دن مسکراتی ہوئی آن موجود ہوتی ہے۔ مجھے جلانے کو!

اس کے کئی رُوپ ہیں کبھی تو وہ مجھے پرانی آسیب زدہ عمارتوں میں بھٹکتی ہوئی کوئی رُوح رُوح لگتی ہے۔ جو اپنی محبت کے مزار پر ماتم کناں ہو۔ کبھی وہ کسی اللہ والی کا سوانگ رچا لیتی ہے اور آ جاتی ہے مجھے خدا کا خوف دلانے۔ اتنی بڑی بڑی باتیں کرتی ہے کہ مَیں اس کے الفاظ اور اس کے چہرے پر بکھرے بھول پن میں کوئی تعلق قائم کرنے کی کوشش میں رہتی ہوں اور وہ اپنی باتوں کو ''لفٹ'' نہ ملتی دیکھ کر جھنجلا کر اُٹھ جاتی ہے۔ جب کبھی وہ شوخ و چنچل الھڑ لڑکی کی طرح اٹھلاتی آتی ہے، نکھرے نکھرے دُھلے سے چہرے کے ساتھ معصوم معصوم کھوئی کھوئی سی۔ اس سمے وہ مجھے بہت پیاری لگتی ہے۔

''مجھے منافق کہتی ہو۔ تو تمھارے یہ سوانگ کسی گنتی میں ہیں۔'' مَیں پوچھتی ہوں۔ اکثر تو وہ اپنی برچھے جیسی تیز نظریں میرے آر پار اُتار دیتی ہے ''جانتی ہو! میرے یہ تمام رُوپ کسی بھی خاص لمحے کے ساتھ پوری ایمانداری کے ساتھ زندہ ہوتے ہیں۔ مَیں کسی بھی لمحے کی پوری گرفت میں ہوتی ہوں اور وہ لمحہ۔ مجھ میں جذب ہو جاتا ہے۔ مگر تم۔'' وہ جل کر کہتی ہے۔ ''تم تو لمحوں کو دُھوکا دینا چاہتی ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم خود کو فریب دے رہی ہو۔ تمھارے اندر ٹوٹ پھوٹ جتنی بڑھتی جاتی ہے۔ تم باہر کے تاروں پر اتنا ہی سریش چپکاتی جاتی ہو۔ منافق۔'' ایسے میں

میرے پاس سوائے ناخن چٹخانے کے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کیوں کہ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اس پر عیاں ہے۔ وہ سچ ہی تو کہتی ہے۔ مَیں تو گھبرا کر فوراً سمجھوتوں پر آمادہ ہو جاتی ہوں لیکن وہ حالات سے ڈر کر کیے جانے والے سمجھوتوں کو بزدلی کہتی ہے۔ ''اس سے تو بہتر ہے کہ تم مر جاؤ۔'' وہ پھنکارتی ہے۔

''مَیں کیا کروں؟۔ یہ سمجھوتے تو دوسروں کی خاطر ہیں۔'' لیکن میری وضاحت بے اثر ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اگر مَیں حق پر ہوں تو سب کو جھکنے پر مجبور کر سکتی ہوں۔ پگلی یہ نہیں جانتی کہ یا یہاں تو حق اور سچائی کے سب کے الگ الگ پیمانے ہیں۔ مَیں کس کس کو اپنے پیمانے سے ناپنے پر مجبور کروں گی۔ یہاں تو سبھی ''ٹھیک'' ہیں۔ ''غلط'' تو مَیں اور میرے جیسے اور کئی سر پھرے ہوتے ہیں جو تھک ہار کر اپنے آپ کو مارنے پر مجبور ہو جاتے۔ یہ اور بات ہے کہ موت کی کئی مختلف شکلیں ہیں۔

یہ چخ چخ، میرے اور اس کے درمیان بار بار ہوتی ہے۔ وہ روٹھ کر پھر آ جاتی ہے۔ لیکن مجھے سوچوں کے عذاب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہے۔ وہ مجھے پیاری ہے۔ بہت پیاری کہ وہی تو میرا سایہ ہے۔

☆☆☆

بہتے پتھر

۱۹۸۰

’’نہ جانے کب یہ دفع ہوگا۔منحوس صورت لے کر یہاں کھڑا رہتا ہے۔‘‘مَیں دل ہی دل میں تاؤ کھاتی آگے بڑھ گئی۔کالج سے واپسی پر اکثر اب مَیں پیدل آنے لگی تھی۔کون بسوں کے انتظار میں کڑی دُھوپ میں چبھتی نظریں برداشت کرتا رہے۔چند فرلانگ کا تو فاصلہ تھا۔ایک تو کاروں،سکوٹروں کا شور،لوفروں کی فقرے بازیاں اور سب سے بڑی مصیبت یہ کلوٹا!

مجھے تقریباً چھ ماہ ہو چکے تھے اس کالج میں داخلہ لیے ہوئے۔شروع شروع میں تو یوں اکیلے آنے جانے پر تھوڑا سا گھبرائی لیکن حالات اور وقت سب سے بڑے اُستاد ہیں۔بچپن میں لکڑی کے کھلونے بنانے والے کو دیکھا کرتی تھی۔اس کے پاؤں میں دبے ایک بے ڈھبے سے اوزار میں چرخی کی طرح گھومتے گھومتے بے رنگ لکڑی کے کھلونے جب باہر نکلتے تو عجیب طرح کے رنگوں میں رنگ چکے ہوتے تھے۔سو وہی حال شاید ہم انسانوں کا بھی ہے۔

نیا ماحول، نئے ساتھی، سب کچھ اجنبی سا لگا تھا مگر چند ہی دنوں میں مَیں محسوس کرنے لگی جیسے مَیں ہمیشہ سے یہیں رہتی آئی ہوں۔ایک دن بس اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ مرے کانوں سے ایک صدا آن ٹکرائی ’’بی بی اللہ کے نام پر‘‘۔مَیں نے گھوم کر دیکھا تو ایک فقیر کھڑا تھا۔مَیں نے غور سے دیکھا۔وہ بھلا چنگا جواں سال شخص تھا۔کھچڑی بال جو شاید ڈھل کر خوبصورت کہلا سکیں۔تیکھے تیکھے نقوش۔گہرا سیاہ رنگ جس میں زردی کی آمیزش تھی وہ ملگجے کپڑوں میں ملبوس تھا۔گھٹنوں تک پھنسا پائجامہ اور ٹوٹے بٹوں والی ایک بے رنگ سی قمیض میں سے اس کے اُلجھے اُلجھے بال

جھانک رہے تھے۔

اس کا بڑا سا کھردرا ہاتھ میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔مَیں نے عادت سے مجبور ہو کر اس کا معائنہ کر ڈالا۔نہ جانے کیوں میری نظر اس کے ہاتھوں سے پھسلتی ہوئی اپنے ہاتھوں پر رُک گئی۔ہاتھوں میں کتنا فرق تھا!اس بے تکے سے خیال پر مَیں دل ہی دل میں ہنس پڑی۔لیکن بظاہر اپنے لہجے میں زور پیدا کرتے ہوئے اسے ڈانٹا ’’شرم نہیں آتی اتنے ہٹے کٹے ہو کر مانگتے ہو؟‘‘ جواب میں اس نے اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کر دی۔’’بی بی کچھ دینا ہے تو دے دو؟ وہ منمنایا،لیکن اس کی منمناہٹ میں بھی یوں لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ تم کون ہوتی ہو یہ سوال کرنے والی۔؟مَیں ہٹا کٹا ہو کر مانگوں یا معذور ہو کر۔یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔

جی میں آئی کہ زور کا ایک تھپڑ رسید کر دوں اس کے چہرے پر،لیکن نہ جانے پھر کیا سوچ کر مَیں نے اپنا پرس کھولا اور ایک اٹھنی نکال کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دی۔اس کی سرخ ہتھیلی پر پھیلی ہوئی کالی کالی لکیریں، اُلجھی اُلجھی ایک دوسرے کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہی تھیں۔مجھے کراہیت سی آئی۔مَیں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور وہ فقیروں کی مخصوص دُعاؤں سے نوازتا آگے بڑھ گیا۔سارا دن وہ کلوٹا میرے حواسوں پر چھایا رہا۔پہلی دفعہ مجھے کسی شخص سے نفرت محسوس ہونے لگی۔مَیں جتنا اس کے خیال کو جھٹکتی، وہ اتنا ہی ذہن سے چپکتا جا رہا تھا آخر میری سوچ نے ہتھیار ڈال دیے کہ اس میں ضرور کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے چونکایا ہے۔مگر وہ بات کیا تھی؟ یہ گھتی سلجھائے نہ سلجھ رہی تھی۔

کالج کی مصروفیات میں صبح کا وہ واقعہ ذہن سے محو ہو گیا ہے لیکن جونہی مَیں گیٹ سے نکلی۔چھناک سے وہ بدتمیز سا فقیر اپنی تمامتر کراہتوں سمیت میرے شعور میں آن براجمان ہوا،لیکن وہ بس سٹاپ پر نہ تھا۔

اگلے دن ایسے ہی لاشعوری طور پر مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا پر وہ نظر نہ آیا ’’اب ضروری تو نہیں کہ وہ ہر وقت یہاں آئے اور اچھا ہے کہ نہ ہے آئے۔‘‘مَیں نے خلوص دل سے سوچا لیکن کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔ہاں! مجھے تسلیم کر لینا چاہیے کہ مجھے اس کا انتظار تھا، نہ جانے

کیوں۔؟ اور آخر وہ آ گیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں شناسائی کی ایک لہر اُبھری۔ جو میرے چہرے پر پھیلے پتھریلے احساس سے ٹکرا کر خاموش واپس لوٹ گئی۔

''اللہ کے نام پر کچھ دے دو'' اس نے صدا لگائی۔ آج اس کا ہاتھ میرے سامنے نہ پھیلا تھا۔ دوسرے لوگوں میں سے چند نے اسے پھٹکارا۔ چند نے اپنی اٹھنیاں، چونیاں قربان کیں اور وہ میری طرف آئے بغیر واپس مڑ گیا۔ مَیں نا اُمیدسی ہوگئی۔ ایسے ہی لاشعوری طور پر۔

اسی طرح دن گزر گئے۔ وہ روز بس سٹاپ پر آتا اور صدا لگا کر چلا جاتا لیکن میرے سامنے اس نے دوبارہ ہاتھ نہ پھیلایا۔ مجھے نہ جانے کیوں اس سے چڑ سی ہوگئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ وہ میرے سامنے صدا لگائے اور مَیں اسے اتنا ڈانٹوں کہ وہ بے بسی کے مارے رو پڑے، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔

اس دن بس سٹاپ پر زیادہ رش نہ تھا۔ مَیں کھڑی تھی آتے جاتے لوگوں کی جلتی نظروں سے میرا خون کھول رہا تھا کہ اچانک مخصوص صدا نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ آج پھر وہ میرے قریب کھڑا تھا۔ اس کا سرخ اور سیاہ ہاتھ میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ جانے کیا ہوا کہ مَیں سب کچھ بھول گئی۔ مَیں نے خاموشی کے ساتھ کسی معمول کی طرح پرس کھولا اور ایک روپیہ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ چیونٹیوں کی سی ٹیڑھی میڑھی لائنوں کی طرح پھیلی لکیروں والی ہتھیلی پر!۔ وہ مجھے ہی تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی وحشت تھی۔ خوف کی ایک لہر نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مَیں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آنکھوں نے جیسے مسمریزم کر دیا۔

''آپ مجھے بہت برا سمجھتی ہیں نا؟'' اس نے مضبوط لہجے میں پوچھا۔

''کیا مطلب ہے تمھارا؟'' مَیں نے اپنی پوری طاقت مجتمع کرتے ہوئے سوال کیا۔

''مَیں اتنا بے وقوف نہیں ہوں بی بی'' طنزیہ مسکراہٹ اس کے کرخت چہرے پر پھیل گی۔

''مَیں سب سمجھتا ہوں، دن میں ہزاروں چہروں سے واسطہ پڑتا ہے۔''

''اس بکواس سے تمھارا کیا مقصد ہے آخر۔ مَیں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔'' مَیں نے دھمکی دی، لیکن اپنے کھوکھلے لہجے سے مَیں خود ہی ڈگمگا گئی۔

''قصور آپ کا بھی نہیں لیکن آپ تو اتنی کتابیں پڑھتی ہیں۔ کیا ان میں بھی یہی لکھا ہے کہ

خوامخواہ ہی دھتکارے لوگوں سے نفرت کرو''

اگرچہ لہجہ سپاٹ تھا لیکن شدید وار کو مَیں سہہ نہ سکی۔ میرے اندر کی حساس لڑکی نے سرگوشی کی ''سن لو۔ یہ جو کہتا ہے اس داستان کو بھی سن لو انسانوں کو پڑھنے کی دعویدار وہ تو ان بکھرے اور ٹھکرائے ہوئے انسانوں کو بھی تو سمجھو''۔ مَیں نے اس آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے لہجے کو دوستانہ بنا لیا۔

''تم اچھے خاصے ہو کر بھیک کیوں مانگتے ہو'' اس تبدیلی پر وہ گڑبڑا سا گیا۔ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا ''تو اور کیا کروں۔ اب تو مزدوری بھی نہیں ملتی۔'' لہجے کی بے چارگی نے مجھے مجبور کر دیا کہ مَیں تسلّی سے اس کی کتھا سنوں۔ لیکن بس سٹاپ پر کھڑے چند لوگ ہمیں مشکوک انداز میں گھورنے لگے تھے۔ مجھے کوفت سی ہونے لگی۔ ''آؤ چلتے ہیں۔ تم مجھے راستے میں اپنی کہانی سناؤ گے؟'' مَیں نے پوچھا تو اس کی آنکھوں میں حیرت در آئی۔

''آپ سن کر کیا کریں گی بی بی۔ ہم غریبوں کی کہانیاں بھی ان کی زندگیوں کی طرح بے رنگ اور پھیکی ہوتی ہیں۔'' اس جملے نے میری آتشِ شوق کو ہوا دی۔ میرے اصرار پر وہ آمادہ ہو گیا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ سڑک پر پیدل چل پڑے۔

''بی بی لوگ ہمیں جانوروں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ وہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہم بھی ان جیسے انسان ہیں۔ پانچوں حواسوں سمیت۔ ہماری بھی خواہشات، ارمان، جذبے ہوتے ہیں۔ جب ہمیں پتھر سمجھ کر ٹھوکریں لگائی جاتی ہیں تو ہم بھی پتھر بن جاتے ہیں۔ جو کبھی کبھی پلٹ کر ''اُن جیسے انسانوں'' کو زخمی بھی کر دیتے ہیں''

پھر اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ دوسرے کئی عام اور غریب آدمیوں کی سی کہانی۔ جو ہمارے اردگرد بکھری رہتی ہیں۔ غربت اور حالات کی چکی میں پسنے والے ان انسانوں کی کہانی جو کبھی تو گندم کی طرح پس جاتے ہیں اور کبھی سخت ریزوں کی مانند گھسٹ گھسٹ کر چکی کے پاٹوں میں گڑھے پیدا کر دیتے ہیں۔ ناانصافیوں کی آگ میں اس کا کنبہ جل گیا تھا۔ وہ تنہا ذات زمانے کی آندھیوں میں بے جان تنکے کی طرح اُڑتے اُڑتے فقیر بن گیا۔ ''کم از کم اس پیشے سے کچی

ذات کونقصان تونہیں پہنچاتا نا'' زہریلی سی ہنسی اس کے کٹے پھٹے ہونٹوں کی دراڑوں کو پر کرنے میں ناکام رہی تھی۔

''تم کوئی مزدوری وغیرہ کرلو نا'' الفاظ یونہی پھسل پڑے۔

''نہیں بی بی اب تو ایک ہی خواہش ہے'' ''کیا'' مَیں نے پوچھا۔ وہ ہچکچانے لگا'' پھر کبھی بتاؤں گا۔'' اس سمے وہ مجھے کسی طور پر ایک عام فقیر نہ لگا۔ ''اب بتا دینے میں کیا ہرج ہے آخر'' میرے اصرار پر وہ گویا ہوا۔ بی بی کون کسی غریب کی بپتا سنتا ہے آج کل۔ وقت کی کمی نے تو خونی رشتوں کے دُکھ سکھ جدا کر دیے ہیں۔ پھر پرائے کس زمرے میں، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ آپ میری مدد ضرور کریں گی'' اس کی نظروں میں اُمید ڈول رہی تھی۔

''ہاں بولو'' ۔۔۔ ''مَیں نے سنا ہے کہ افریقہ میں قحط پڑا ہے۔ وہاں کے لوگ بھوکوں مر رہے ہیں؟'' اس نے تصدیق طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ ''ہاں آج کل وہاں چند علاقوں میں حالات بہت خراب ہیں'' مَیں نے جواب دیا۔ ''بی بی مَیں نے زندگی میں کسی کو کچھ فائدہ نہیں دیا۔ ہم غریب تو اپنے دُکھوں میں اس طرح جکڑے رہتے ہیں کہ کسی اور جانب نگاہ ڈالنی مشکل ہو جاتی ہے۔ جب اپنا ہی گھر تاریک ہو تو دوسروں کو روشنی کہاں سے دیں، لیکن مَیں نے پہلی دفعہ نیکی کرنے کی ہمت پائی ہے'' یہ کہہ کر اس نے اپنی قمیض کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک بوسیدہ سی پوٹلی باہر نکالی۔ بڑے احترام کے ساتھ اس نے پوٹلی کو کھولا۔ اس کے کھردرے سے ہاتھ موم کی طرح پگھلتے محسوس ہو رہے تھے۔ شاید جذبات کی حدت سے۔ پوٹلی میں چند سو سو اور دس دس کے کچھ نوٹ تھے۔ اس نے بڑے پیار سے سمیٹ کر وہ نوٹ میری طرف بڑھائے۔

''بی بی اگرچہ یہ کچھ بھی نہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی خاندان کو دو وقت کی روٹی میسر آ جائے۔ کوئی بچہ چند دن اور زندہ رہ لے۔ شاید مَیں اس طرح بخشا جاؤں۔ یہ پیسے میری طرف سے افریقہ بھجوا دیں۔''

''مگر۔ مگر'' مَیں نے کچھ کہنا چاہا۔

تو وہ سر جھکا کر گلوگیر آواز میں صرف اتنا کہہ سکا'' خدا کی قسم بی بی۔ یہ ایک ایک پیسہ میری

محنت مزدوری کا ہے۔ مانگے کا نہیں۔''

میری نم ہوتی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ اپنے بڑے بڑے کھردرے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر وہ کسی معصوم سے بچے کی طرح سسک پڑا۔

☆☆☆

تجدیدِ عہد

۱۹۸۰

آزاد فضا میں پرواز کرتے ہوئے۔ پرندے نے خوشی سے چونچ کھولی اور ایک غوطہ لگا کر ہوا کے دوش پر تیرنے لگا۔ اپنے نرم پروں کو اس نے سرسراتے ہوئے محسوس کیا ایک مغرور انداز میں اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ خوبصورت اور سڈول جسم کو کچھ لہرا کر کچھ سمٹا کر وہ مزید نیچے آ گیا۔ چمکتی دمکتی دُنیا اس کے نیچے رواں دواں تھی۔ انسانوں کے ہجوم۔ کھلونوں سے گھر اور ڈبوں کی طرح رینگتی ہوئی گاڑیاں سب کچھ کتنا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ خوبصورت باغ اب اسے ایک نقطے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے ایک اُونچے سے درخت پر اس کا ننھا سا آشیانہ تھا۔ اس کے تصور میں اپنی مادہ کا چہرہ آ گیا جو آج کل انڈوں پر بیٹھی تھی۔ اپنے پر پھیلائے آنکھیں نیم وا کیے کچھ نخوت لیے وہ انڈوں پر بیٹھی ہوتی تو پرندے کو بے اختیار پیار آ جاتا۔ کسی بے حد محتاط ذی رُوح کی طرح اپنی پونجی کو سینے سے لگائے، وہ چوکنی نگاہوں سے کبھی کبھی ادھر ادھر دیکھ لیتی اور پھر مطمئن ہو کر، ہولے سے آنکھیں موند لیتی۔

پرندے کے اظہارِ محبت پر اسے تنبیہ آمیز انداز میں ہلکے سے چونچ مارتی۔ جب وہ چونچ میں دانہ دنکا دبائے گھونسلے میں داخل ہوتا تو مادہ کی نیم وا چونچ کو دیکھ کر ایک عجیب احساس ذمہ داری سے اس کا سینہ پھول جاتا اپنے پروں کو دھیمے دھیمے جھٹکے دیتا۔ وہ آگے بڑھتا اور دانہ مادہ کے آگے ڈال دیتا۔

''اے انسانوں دیکھو تو مَیں کتنا خوش قسمت ہوں'' یہ سوچ اسے خوشی کا ایک نعرہ بلند کرنے

پر مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن افسوس کہ انسان اس کی زبان نہیں سمجھ سکتا۔

اور آج تو وہ بے حد خوش تھا۔ آج اس کے انڈوں سے بچے جو نکلے تھے۔ نیلگوں آسمان کی جانب چمکتی آنکھیں کیں تو سورج جگمگا رہا تھا۔ نشے میں چور بوجھل بوجھل سیاہ بادل اکا دکا ڈول رہے تھے۔ بارش کا کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ فضا میں غوطے لگا لگا کر ابھی اس کا جی نہ بھرا تھا۔ لیکن خوراک کا بندوبست بھی تو کرنا تھا۔ یہی سوچ کر وہ ایک آنگن میں جا اترا۔ روتے پیٹتے ہجوم کو دیکھا اور گھبرا کر اُڑ گیا۔ لیکن ننھے سے دل میں تجسّس نے آنکھ کھولی۔ وہ پھر وہیں آ گیا۔ منڈیر پر بیٹھے بیٹھے جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ کوئی مر گیا ہے۔ اس آنگن میں۔ اس طرح کے کئی نظارے وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

جب پہلے پہل اُڑنا سیکھا تو ماں اسے ایسے ہی ایک گھر میں لے گئی تھی۔ جہاں سے جنازہ اٹھا رہا تھا۔ ماں نے کہا تھا ''بیٹا مَیں تمھیں اس لیے یہاں لائی ہوں۔ تاکہ تم سمجھ لو کہ تم نے سدا ان فضاؤں میں آزاد نہیں پھرنا۔ یا پھر انسانوں کی بستیوں کے عیش و آرام دیکھ کر ناشکرے ہو جاؤ۔ ایک چیز ایسی بھی ہے جس کے آگے اشرف المخلوقات بھی بے بس ہے اور وہ ہے مشیّتِ ایزدی اس لیے کبھی اپنے حال کو برا نہ جاننا۔'' ماں کی نصیحت تمام عمر اس کے ساتھ رہی۔ انسانوں کی مائیں بھی تو ایسی نصیحتیں کرتی ہوں گی تو پھر انسان کیوں اپنے حال پر خوش نہیں؟ اس نے کئی بار سوچا، مگر کوئی جواب نہ مل سکا۔

وہ دھیرے سے اس آنگن سے اُڑ گیا۔ مگر پرواز میں اب پہلے کی سی مستی نہ تھی۔ اداس اداس سا وہ کسی دوسرے آنگن میں جا اترا۔ چاولوں کے بکھرے کچھ دانے خود چُنے اور کچھ چونچ میں دبا کر اُڑ گیا۔ باغ کے قریب پہنچتے وہ کسی حد تک سنبھل چکا تھا۔ درخت کے قریب پہنچ کر وہ اپنے مخصوص انداز میں چہچہایا۔ جواباً مادہ نے ہلکی سی ''چک چک'' کی اور وہ سب کچھ بھول گیا۔ سوائے اپنے گھونسلے کے مادہ نے اپنا ننھا منا سا گول سر باہر نکالا اور پٹ پٹ کرتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ گھونسلے کے قریب نیچی سی شاخ پر بیٹھ کر اس نے سر جھکایا اور چاول کے دانے مادہ کے آگے ڈال دیے۔ مادہ نے شریری نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے پروں کو سنوارنے لگی۔ پرندے نے جھک

کر انڈوں کو جھانکنا چاہا تو مادہ نے ہولے سے اس کے سر پر ٹھونگا مارا۔ ''واہ بھئی اب تو جیسے ہمارا کوئی حق ہی نہیں رہا۔'' وہ چہچہایا۔ مادہ نے ہلکی سی ''چک چک'' کی اور کچھ اور پھیل کر بیٹھ گئی۔

شام کے سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ باغ میں پرندوں کا خوب شور تھا سب اپنے گھونسلوں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ کتنے ہی مختلف قبائل آباد تھے اس گنجان باغ میں۔ ساتھ والے گھونسلے میں سے ننھے منے بچوں کی چوں چوں سنائی دے رہی تھی۔ ایک چڑیا اور چڑا اپنے بچوں کے ساتھ گپ شپ لگا رہے تھے۔ ''بس چند گھنٹوں کی تو بات ہے پھر ہمارا گھونسلہ بھی بچوں کی آوازوں سے بھر جائے گا۔'' اس سوچ کے ساتھ پرندے نے مادہ کی جانب دیکھا تو جیسے وہ بھی یہی سوچ رہی تھی۔ اس نے تائید میں سر ہلا دیا۔ سورج کے ڈوبتے ہی۔ پرندوں کی آوازوں میں بھی کمی آ گئی۔ کبھی کبھار کوئی کوک۔ چہچہاہٹ یا کرخت سی کائیں سنائی دے جاتی تھی۔ پرندے نے بھی اپنے پَروں کو جھاڑا اور گھونسلے میں سرک آیا۔ مادہ نے اپنے پَر کچھ سمیٹ لیے۔ اب بس اندھیرے کی آہٹ پتوں کی سرسراہٹ یا پروں کی نرماہٹ تھی۔ دونوں چپ چاپ تھے۔ مادہ نے اپنا نازک سا سر پرندے کی گردن تلے رکھ دیا۔ یوں وہ اپنی جانب سے پوری طرح محفوظ ہو گئی اور پرندے کا احساسِ تفاخر کچھ اور بڑھ گیا۔ دونوں نیم غنودگی کے عالم میں تھے کہ ہلکی سی ''چک چک'' سے چونک پڑے۔ ارے یہ کیا؟ دو ننھے سے سر مادہ کے پَروں تلے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کہیں دور بھاگ گئی۔ وہ خوشی سے بچوں کو اپنے پَروں سے تھپکنے لگے۔ ابھی دو انڈے باقی تھے۔ دونوں بچوں کی زرد زرد چونچیں کھلنے اور بند ہونے لگیں۔ ان کی کالی کالی آنکھیں، اندھیرے میں اپنے گرد و پیش کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن مادہ اور نر کے پَروں کے محبت بھرے لمس اور گرمی کے سوا وہ ابھی دُنیا کے بارے میں کچھ اور نہ جان پائے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سو گئے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ یوں لگا جیسے درخت کو کسی نے جھنجوڑا ہو۔ ہوش سنبھلے تو شدید آندھی شروع ہو چکی تھی۔ ''شوں شوں'' کی تیز آوازوں سے ان کے ننھے سے دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگے۔ درخت تیز ہوا سے ڈول رہا تھا۔ ابھی اس ناگہانی آفت کو سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ بجلی کی کڑک اور چمک نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ وہ دونوں بچوں اور انڈوں کو سمیٹ کر

ایک دوسرے کے پَروں میں پر پھنسا کر بیٹھ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگی۔ ''اوہ۔ ہمارے بچے۔ ہمارا گھونسلہ۔ مادہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ لمحے سرک رہے تھے۔ اور طوفان میں شدّت آتی جا رہی تھی۔ ایسے سمے گھونسلے سے نکلنا بھی موت کو دعوت دینا تھا۔

بارش اور آندھی کے شور کے ساتھ ساتھ پرندوں کی ملی جلی چیخ و پکار۔ عجب سماں تھا۔ پرندے کو اتنا یاد رہا کہ اس نے مضبوطی کے ساتھ مادہ کو اپنے پَروں تلے سمیٹ لیا تھا اور مادہ نے آخری بار کہا تھا ''ہمارے بچے۔''

اگلی صبح بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ سورج دھیرے دھیرے آسمان پر نمودار ہوا۔ روپہلی کرنوں نے اپنا جال زمین کے چہرے پر پھینکا۔ چند کرنیں باغ پر بھی پڑیں۔ تمام درخت زمیں بوس ہو چکے تھے۔ سبزہ پامال تھا۔ پانی یوں انجان بنا جگہ جگہ کھڑا تھا۔ جیسے اس سارے ماحول سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ چند زخمی پرندے اِدھر اُدھر لنگڑاتے پھر رہے تھے۔ کچھ اپنے گھونسلوں کی تباہی پر ماتم کناں تھے اور کچھ مردہ حالت میں پڑے تھے۔ اسی اثنا میں چند شریر بچے اِدھر آن نکلے۔ پانی میں چھینٹے اُڑاتے۔ ایک بچے کی نظر اس گھونسلے پر جا پڑی۔ ''دیکھو کتنے خوبصورت پرندے۔'' وہ چلایا۔ سب بچے بھاگے آئے۔ ''ارے اِدھر آؤ سب۔'' وہ حیرت سے چلائے گھونسلے میں دو پرندے۔'' ایک دوسرے سے یوں لپٹے پڑے تھے جیسے سو رہے ہوں۔ ان کے سنہرے پَر بھیگ چکے تھے اور نیچے سے دو ننھے سر بھی جھانک رہے تھے، جن کے بھاری پپوٹے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے تھے۔ قریب ہی دو ننھے ننھے انڈوں کے چھلکے بھی پڑے تھے۔ پاس کھڑے دو نیم جاں سے نوزائیدہ بچے سردی سے بچنے کی خاطر، ان مردہ جسموں کے پَروں میں سر دے رہے تھے۔ بچوں کے غول کو قریب پا کر اُنھوں نے اپنی معصوم اور حیران نگاہیں ان پر گاڑ دیں۔ دو ہاتھوں نے بڑھ کر اُنھیں اُٹھا لیا۔ احتجاجاً اُنھوں نے اپنی چونچیں کھولیں۔ ہلکی سی چک چک کی۔ لیکن نرم ہاتھوں کی مہربان گرمی سے مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

دردگراں

ابھی ابھی تمھاری اور میری بیٹی میرے پاس بیٹھی تھی۔ وہی تمھارے جیسا دل موہ لینے والا
انداز تھا۔ بڑے پیار سے اس نے اپنی ننھی ننھی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ ''امی آپ کیوں
روتی ہیں؟ مت رویا کریں نا۔ ورنہ مَیں بھی رو پڑوں گی'' اس کی بھونرا سی سیاہ آنکھیں نہایت
معصومیت کے ساتھ مجھے تک رہی تھیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ تمھاری آنکھیں ہوں۔
متجسس جو ہمیشہ میرے وجود میں نہ جانے کیا تلاش کرتی رہتی تھیں۔ جو چیزیں ہم سے کھو
جاتی ہیں۔ وہ کیوں بھیس بدل بدل کر راہ میں آن بیٹھتی ہیں؟ شاید رہا سہا سکون بھی چھین لینے کو۔
کیسے کیسے جتن کیے تھے۔ کس کس طرح دل کو سمجھایا تھا کہ تمھارے بغیر بھی زندگی کٹ جائے
گی لیکن تم۔۔۔تم بہت ظالم ہو مجھ سے میرا سب کچھ چھین لینا چاہتے ہو۔ تمھاری چاہت نے
میری رُوح کو تابندگی دے کر غم کی دُھوپ میں جھلسنے کے لیے چھوڑ دیا اور اب تمھاری بیٹی مجھے محبت
کا زہر پلا رہی ہے۔ مَیں جانتی ہوں وہ بھی ایک دن دامن جھٹک کر چل دے گی اور مَیں خزاں
رسیدہ پتے کی طرح حالات کے بگولوں میں اُڑتی پھروں گی۔

تمھیں کیا معلوم؟ تم سے بچھڑ کر مَیں نے کئی راتیں اسی نہر کے کنارے جلتے ہوئے گزاریں
جہاں ہم ملا کرتے تھے۔ تم تو اس وقت شاید اپنی جیون ساتھی سے دھیمے دھیمے سرگوشیاں کر رہے ہو
گے۔ خوشیاں تمھارے گرد جمگھٹا ڈالے ہوں گی اور تم نے شاید ایک منٹ کے ہزارویں حصے میں
میرے بارے میں سوچا ہوگا اور سر جھٹک دیا ہوگا۔

لیکن بتاؤ تو کون جیتا اور کون ہارا؟ مانو نہ مانو جیت میری ہی ہوئی۔ امریکہ کی ہنگامہ خیز اور

رنگین دُنیا بھی میرے اس چھوٹے سے گھر کی یاد کو مجھ سے جدا کرنے میں ناکام رہی۔ جہاں ہماری
جنت تھی۔ وہ جنت جس سے اس مرتبہ حوا کو نکلنا پڑا تھا۔ آدم کے کہنے پر! خوبصورت سجے سجائے
کمرے میں ہیٹر کے سامنے بیٹھ کر ہم دُنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ سرخ سرخ شعلے لپکتے تھے
تو زندگی کی حرارت رگوں میں دوڑتی محسوس ہوتی تھی۔ تم چلغوزے چھیل چھیل کر رکھتے جاتے اور
مَیں کھاتی جایا کرتی تھی۔ اس وقت مجھے بہت کچھ یاد آ رہا ہے۔ سب کچھ گڈمڈ سا ہو رہا ہے۔ ذہن
میں۔ خیالات کی یورش ہے اور مَیں خود نہ جانے کہاں کھو گئی ہوں۔ تمھیں بھی شاید اپنی تکمیل کی
خاطر چاہا تھا۔ لیکن لگتا ہے کہ میرا اپنا آدھا بھی کہیں کھو گیا ہے۔ تحلیل ہو گیا ہے۔

تمھیں یاد ہے؟ ایک مرتبہ مَیں ایک چھوٹے سے خوبصورت پرندے کو پکڑنے کی خاطر
آگے آگے جھاڑیوں میں بھاگتی گئی تھی۔ پُر خار راستہ سے بے خبر! اور احساس تب ہوا تھا جب سارا
دامن کانٹوں سے بھر چکا تھا اور پرندہ دور فضا کی وسعتوں میں گم ہو چکا تھا۔ کئی بار امریکہ کی پُر ہجوم
شاہراہوں پر تیز تیز چلتے ہوئے مجھے وہ اجاڑ سی پگڈنڈی بری طرح یاد آئی۔ جس کے کنارے نرم
نرم گھاس اور نوکیلے سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ تم اور مَیں رات کو وہاں دبے پاؤں چہل قدمی کیا
کرتے تھے۔ ہوا کی وہ سہمی سہمی سرگوشیاں ابھی تک کانوں میں گونجتی ہیں۔

اپنوں کی بیگانگی مول لے کر تمھارے آنگن کی بہار بنی تھی۔ لیکن خواب تو خواب ہی ہوتے
ہیں نا۔! چھ سال یوں گزرے جیسے چھ دن۔ تمھاری نگاہوں میں طلب سوال بن کر اُبھرنے لگی۔
مَیں سہم سی گئی۔ اس بے نیاز کے حضور سجدے بھی کیے، لیکن بنجر دھرتی بھی کبھی ہری ہو سکی ہے بھلا؟
تم نے بھی میرے دل کا درد نہ جانا؟ مَیں ادھوری عورت ماں بننے کے اعزاز سے محروم رہی۔ ہم
سفر ہو کر بھی تم کتنی دور چلے گئے۔ کیا تم نے مجھے محض اس لیے چاہا تھا کہ مَیں تمھارے بچوں کی ماں
بنوں اور بس؟ کیا میرا اپنا وجود بے معنی تھا؟ بے کار تھا؟ میری آرزوؤں تمناؤں کی کوئی وقعت نہ
تھی۔ محبت کی چھاؤں پر میرا کوئی حق نہ تھا؟ تم بھی وہی روایتی مرد نکلے۔ ہاں یہ احسان ضرور کیا کہ
مجھے مطلقہ ہونے کے طعنے سے بچا لیا۔ مَیں اپنے ہاتھوں تمھاری دلہن تمھارے حوالے کر کے۔ تم
سے دور بہت دور چلی آئی۔

لیکن یہاں آ کر محسوس ہوا کہ تم سے دوری کا احساس بھی جان لیوا ہے لیکن کیا کروں۔ مَیں اتنا حوصلہ کہاں سے لاتی کہ تمھیں دن رات کسی کے ساتھ Share کر سکتی۔ یقین مانو مَیں تو آج تک اس بات پر حیران ہوں کہ تمھاری دلہن کی سیج سجاتے وقت میرا دل شدّتِ غم سے پھٹ کیوں نہ گیا!

معلوم ہے جب مجھے تمھاری بیٹی کی پیدائش کی خبر ملی تو مَیں کتنا پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ مجھے آج تک نہیں خبر کہ وہ آنسو خوشی کے تھے یا ماتم کے؟ اپنی محرومی کا غم تھا یا تمھاری تمنا کی تکمیل کا جشن۔ وہ رات مَیں نے سڑکوں پر تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے گزار دی۔

نہ چاہنے کے باوجود مَیں نے سامان سمیٹا اور پاکستان چلی آئی۔ تم نے لکھا تھا۔ ''جلد آ جاؤ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔ ثنا، کرن کو میرے حوالے کر کے اس دُنیا سے چلی گئی ہے۔'' شاید یہی سوچ کر کہ جب تمھاری خوشیوں کے محل اپنی چتا پر تعمیر کر سکتی ہوں تو تمھارے آنسو بھی اپنے تار تار دامن سے پونچھوں گی۔ مَیں پھر وہیں آ گئی جہاں سے گئی تھی۔ کرن کے معصوم پیار نے میرے زخموں پر مرہم رکھنا شروع کر دیا تھا۔ ائیر پورٹ پر مَیں نے تم سے کہا تھا ''احتشام مَیں تمھاری بیٹی کو تو ماں کا پیار دوں گی۔ لیکن تمھارا ساتھ شاید نہ دے سکوں'' شاید یہ میرے زخمی انا کی آواز تھی اور اب جب کہ کرن توتلی زبان میں مجھے امی کہنے لگی ہے تو تم مجھے منانے آئے ہو۔

اس کے معصوم بے گناہ آنسوؤں کے پیچھے تمھارے نادم چہرے کا عکس دیکھ کر مَیں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس جنت کو پہلے کی طرح آباد کر دوں ایک اکائی کی طرح مضبوط کر دوں اور اب بہتے آنسوؤں کے درمیان میں بہت مطمئن ہوں۔

معاف کر دینے کا احساس کتنا خوبصورت اور کتنا مکمل کر دینے والا ہے۔ کاش تمھیں بھی اس کا اندازہ ہوتا!

☆☆☆

بھاری پتھر

کچھ علم نہیں کہ سمے کے پل کے نیچے سے کتنا پانی بہہ چکا ہے؟۔ دُھندلے شیشوں کے پار، جلتے ہوئے سگریٹ کے دُھوئیں کے پار، مَیں نے کتنی ہی بار اس کی شبیہہ کو ذہن کے پردے پر نمایاں کرنا چاہا مگر ہر بار آنسوؤں نے اس کے خدوخال کو مزید دُھندلا دیا۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے صدیوں سے مَیں یونہی بیٹھا، اسے سوچے جا رہا ہوں۔ وہ جو میری کچھ بھی نہ تھی۔ مگر اب لگتا ہے کہ وہ مجھ سے الگ، کوئی علیٰحدہ وجود نہ تھی بلکہ میری ہی ذات کا کھویا ہوا حصہ تھی۔

چند دنوں کی یا لمحوں کی شناسائی کو آپ محبت کا نام دے سکتے ہیں اور نہ ہی کسی اور تعلق کی ڈور سے باندھ سکتے ہیں۔ تو پھر مَیں کیوں اتنا بے چین ہوں؟ کیوں اتنا Confuse ہوں؟ کس کی آخری سرگوشی میرے کانوں میں جم کر رہ گئی ہے؟ وہ سرگوشی تھی یا چیخ! جس کی بازگشت میرے لہو میں کسی وحشی کی طرح گردش کر رہی ہے۔

''کل رات ڈولی نے Suicide cmmitt کر لی اور تمھارے نام یہ خط چھوڑ گئی ہے''

اور مَیں۔ پتھر سا وجود لیے۔ احساس کے ساحل پر تند و تیز موجوں سے لڑ رہا ہوں۔ لڑتا جا رہا ہوں۔ مگر شور ہے کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ ڈولی کی شبیہہ دُھندلی سے دُھندلی تر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ معمہ سی لڑکی ہمیشہ کی طرح اپنی موت کو بھی ایک معمہ بنا گئی شاید اور مجھے سوچ کے صحرا میں آبلہ پا چھوڑ گئی۔ مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں کہ اس بند لفافے کو ہی کھول سکوں۔ ازلی بزدل جو ٹھہرا۔ ٹھہرو! شاید کچھ نشانات مل رہے ہیں۔ دُھوپ کا کرب کچھ کم ہو رہا ہے۔ میرے لہو میں ناچتے وحشی ہانپنے لگے ہیں اور ڈولی میرے قریب آ رہی ہے۔

کندھے پر کینوس کا بڑا سا تھیلا لٹکائے۔ لاپرواہ سا انداز وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ کہ جاوید کو دیکھ کر رُک گئی۔ ''جاوید پلیز آج میرے نوٹس تو واپس کر دینا۔'' اور جواب سنے بغیر غائب

''عجیب لڑکی ہے۔'' مَیں نے جاوید سے کہا۔

''عجیب سی عجیب''! جاوید بولا ''ہم تو اسے مائی ملنگنی کہتے ہیں۔ سخت موڈی لڑکی ہے۔ جی چاہے گا تو تمھارے ساتھ پیدل بھی سڑکوں پر ماری ماری پھرے گی اور موڈ نہ ہوگا تو پاس سے اجنبیوں کی طرح گزر جائے گی۔''

"Interesting" مَیں نے ہولے سے سیٹی بجائی۔

"Rather facinating" جاوید ہنسا۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ یونیورسٹی جانا ہوا۔ مگر ڈولی سے بات چیت کا موقع نہ مل سکا۔ ویسے بھی اپنی زندگی کے تھوڑے بکھیڑے تھے!

لیکن اس کی انفرادیت اور جاذبیت کا میں شکار ہو چکا تھا۔ کبھی کبھار وہ ہجوم میں گھری، بے تحاشہ ہنستی۔ بچوں کی طرح کھیلتی کودتی۔ کوئی بےفکر سی سکول گرل نظر آتی۔ لیکن جب کبھی کسی ستون یا دیوار کے سہارے وہ تنہا کھڑی ہوئی تو نہ جانے کیوں مجھے اچانک ہی کسی ٹوٹے پھوٹے، اجڑے مزار پر جلنے والے اداس دیے یاد آنے لگتے۔ کئی دفعہ تو یوں لگتا کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ محض ایک عام سی لڑکی ہے۔ جسے میرے تخیل نے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔

انھی دنوں یونیورسٹی میں الیکشن کی گہما گہمی شروع ہوگئی۔ ڈولی خاصی سرگرم دکھائی دینے لگی۔ جوشیلی، تمتماتی ہوئی۔ ہر پل عجلت میں۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز مجھے بے تحاشہ اپیل کرنے لگا۔ کتنا جارحانہ اور Challanging سا انداز تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ مَیں ایک باغی رُوح کے ہوتے ہوئے بھی۔ ایک بزدل جسم کے سہارے اس دُنیا سے سمجھوتے کیے بیٹھا تھا۔ اپنے اندر کا عکس۔ ڈولی کے باہر جھلملاتا نظر آیا تو بے حد اچھا لگا۔ ان دنوں ہمیں اکثر بحث مباحثے کے موقع ملنے لگے۔ وہ جوشیلے پیرائے میں مخالفین کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتی۔ دلیلیں دیتی اور اپنے معصوم چہرے کے برعکس فلسفیانہ گفتگو کرتی۔

جونہی ادھر ادھر کا کوئی موضوع چھڑتا۔ وہ اتنی بے ساختگی کے ساتھ جواب دیتی کہ ہر سچ اُگل دینے کو جی چاہتا۔ ایسے ہی کچھ ایمان دار لمحوں سے مغلوب ہو کر مَیں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا۔ جو مَیں اس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ اوٹ پٹانگ تجزیے۔، ڈھکی چھپی خواہشات، ادھورے خواب وہ دیر تک بُنتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی ذہین آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے اور میرا چہرہ تپنے لگا۔ ''تم مجھے اچھے لگتے ہو لیکن تمھارے ساتھ وابستہ ہو کر مَیں اپنی ذات کا دُکھ تمھارے اندر نہیں اتارنا چاہتی۔ میرے ساتھ نباہ کرنا خاصہ مشکل ہے''۔ یہ جملہ اپنی تمام تر گھمبیرتا سمیت میرے وجود کا ایک حصہ بن گیا۔ یہ ہماری ذاتی موضوع پر پہلی اور آخری بات تھی۔ اس کے بعد سرسری سا ٹکراؤ بارہا ہوا مگر ڈولی کا روّیہ قطعی نارمل تھا۔ مَیں بھی اپنے خول میں سمٹ گیا۔ مگر ایک خلش کی انی میرے اندر کہیں مسلسل چبھتی رہی۔

شاید کبھی، کہیں، کسی لمحے ڈولی میرے لیے لوٹ آئے، مگر صدیاں بیت گئیں۔ جاوید کی زبانی پتہ چلا کہ ڈولی کا کچھ عرصہ پہلے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ اب بہتر ہے اور یہیں job کر رہی ہے۔ مَیں چاہتے ہوئے بھی اس کا ایڈریس نہ پوچھ سکا کہ ریشم کا کوہا اپنے خول سے باہر نہ آ سکا۔ وقت کچھ اور پیچھے کی طرف سرک گیا۔ ایک دن اخبار میں ڈولی کی کسی بڑے صنعت کار کے ساتھ شادی کی خبر پڑھی۔ عجیب متضاد سے احساسات نے مجھے کئی روز ماؤف کیے رکھا۔

دھیرے دھیرے، وقت کے گدھ نے اپنے پنجوں کے نشانات میرے چہرے پر ثبت کرنے شروع کر دیے۔ گردشِ دوراں میں اُلجھ کر بہت سی یادوں کو، دل کے کونوں کھدروں میں دھکیل دیا۔

شادی، بچے، ذمہ داریاں۔ پل بھر کو فرصت ملتی تو ایک آوارہ سا جملہ، دل کے نہاں خانوں میں اپنی چاپ چھوڑ جاتا۔ ''تم مجھے اچھے تو لگتے ہو مگر تم سے وابستہ ہو کر۔'' لیکن اگلے ہی لمحے، زندگی کے دندناتے مسائل اپنے قدموں کی دھمک سے اس ہلکی سی چاپ کا فسوں کچل دیتے۔

اور آج۔۔۔ جب مَیں کتنے ہی دکھوں اور سکھوں کی ترائیاں اور چڑھائیاں گزر آیا ہوں۔ تو ایک نئے دُکھ کا سورج۔ سر پر آن کھڑا ہوا ہے۔

مَیں ابھی تک سوچ رہا ہوں۔ دُھندلے شیشوں کے پار، سگریٹ کے دُھوئیں کے پار، ڈولی کی شبیہہ کو سمیٹنے کی کوشش میں۔۔۔ مگر ہاتھ میں دبے لفافے کو کھولنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں جیسے اس میں چھپا ہوا کوئی ناگ یا بچھو میرے بھرم کو ڈس جائے گا۔ جو مَیں نے اتنے برسوں کی محنت سے قائم کر رکھا ہے۔

مگر عمر کے اس آخری سنگ میل پر ڈولی کی خودکشی کے کیا معنی؟ اب تو اگلا پڑاؤ وہی تھا تو جانے میں اتنی عجلت کیوں کی۔؟

تجسّس نے آخر خوف کو شکست دے دی۔ مَیں نے کانپتے بوڑھے ہاتھوں کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔

''وہ ایک جملہ جو کبھی تم سے کہا تھا۔ اس کے جواب کا بہت انتظار کیا مَیں نے۔ جانتی ہوں کہ بزدل ہو، مگر پھر بھی تمھارے بھرم کی خاطر جلد جا رہی ہوں۔ ان اُمیدوں کا بھی تو بھرم رکھنا تھا۔ جو کہتی تھیں کہ شاید تم آؤ اور کہو مجھ سے ''ڈولی مَیں تمھاری ذات کے سارے دُکھ سمیٹ لوں گا۔''

اب مَین سوچ جا رہا ہوں کہ مَیں تو سارے قرض چکا کر۔ ہلکا پھلکا ہو کر پہلی دفعہ زندگی میں سکون کی سانس لے کر بیٹھا تھا۔ یکایک۔ اس قرض کا بھاری پتھر، سینے کو کیوں کچلے جا رہا ہے؟

☆☆☆

مصنفہ کی دیگر کتب

آدھا سچ (کہانیاں)

میٹھا سچ (کہانیاں)

سچے جھوٹ اور دوسری کہانیاں (مجموعہ)

سیلف پورٹریٹ اور دوسری کہانیاں (انتخاب و مقدمہ؛ رابعہ)

ڈرامے

فرحین چوہدری (شہابہ گیلانی) آج کے دور کی لڑکی کی نمایندہ ہے اس کی شخصیت کا جزوعظیم بلبلے ہیں۔ وہ سوڈے کی بوتل کی مصداق ہے جس میں سے بلبلے اُٹھتے رہتے ہیں۔

فرحین (شہابہ) کے جذباتی سلف میں لہریں اُٹھتی ہیں چھینٹے اُڑتے ہیں۔ گھمن گھیریاں گھومتی ہیں۔ اس کا ذہنی سلف ایک جھیل کی مانند ہے ٹھہرا ہوا نیلا شفاف پانی۔

فرحین (شہابہ) ایک ایسی بہلی ہے جس کا ایک پہیہ گول ہے اور دوسرا چوکور، لیکن یہ بہلی چلتی ہے، چلے جاتی ہے یوں جیسے پانی میں راج ہنس تیرتا ہے۔

ممتاز مفتی

دستاویز
DASTAVEZ